صفر المظفر ۱۴۴۷ھ
اگست ۲۰۲۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- قرآنی سُورتوں کے مابین نسبتِ زوجیت
- استحکامِ پاکستان اور اتحادِ اُمت
- معاہداتِ امن اور مُسلم اُمّہ کا کردار
- پاکستان اور اسرائیل

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل
بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:
مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی
امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ دیدہ زیب مضبوط جلد ❁ 1248 صفحات
-/4500 روپے کے بجائے
صرف -/2200 روپے میں
فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ
رمضان پیکج کے تسلسل میں
مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)
”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد : 74
شمارہ : 8
صفر المظفر 1447ھ
اگست 2025ء
فی شمارہ : 50 روپے
سالانہ زرِ تعاون : 500 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت
○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا
○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران
○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

مکتبہ خدام القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375
ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ____ 5
استحکامِ پاکستان اور اتحادِ اُمّت — رضاء الحق

تذکرہ و تبصرہ ____ 10
معاہداتِ امن اور مسلم اُمّہ کا کردار — شجاع الدین شیخ

درسِ قرآن ____ 13
سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ (۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکّر و تدبّر ____ 33
قرآنی سورتوں کے مابین نسبتِ زوجیت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ظروف و احوال ____ 43
پاکستان اور اسرائیل — ایوب بیگ مرزا

مطالعۂ قرآن حکیم ____ 49
سورۃ الکوثر: چند تشریحی پہلو — مولانا عبدالمتین

حُسنِ معاشرت ____ 57
کسبِ حلال — سعد عبداللہ

دعوتِ فکر ____ 63
عالَمِ اسلام کی زبوں حالی اور اس کا علاج — ممتاز ہاشمی

حقیقتِ دین ____ 69
اسماء اللہ الحسنیٰ (۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یادِ رفتگاں ____ 78
آہ قمر سعید قریشی! — مولانا شیخ رحیم الدین

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استحکامِ پاکستان اور اتحادِ اُمّت

انسان کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ وہ اکیلا اِس دنیا میں آتا ہے اور اکیلا ہی دارِفانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ البتہ وہ مہد سے لحد تک کا سفر نہ اکیلا کرنا چاہتا ہے اور نہ اکیلا کر سکتا ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد‘ کسی قبیلے کے رُکن‘ کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اِسی لیے انسان کو معاشرتی ”حیوان“ کہا جاتا ہے‘ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کے لیے معاشرے کی وہی حیثیت ہے جو مچھلی کے لیے پانی کی ہے۔ انسان کی انفرادیت بڑی محدود ہے۔ وہ چھوٹے موٹے روزمرّہ کے اُمور میں سے بعض تنہا ہی کر لیتا ہے۔ غور و فکر اور عملی طور پر کسی کام کا آغاز تو تنہا کر سکتا ہے‘ لیکن تنہا کسی ایسے کام کو منطقی انجام تک نہیں پہنچا سکتا جو معاشرے پر اثرات مرتّب کرے۔ اجتماعیت انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ لہٰذا انسان پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے‘ اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنی اخلاقی و روحانی تکمیل کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جِدّوجُہد کرے۔ مقصد کے حصول کے لیے اجتماعی دانش اور اجتماعی جِدّوجُہد انسان کی ضرورت ہی نہیں مجبوری بھی ہے۔

انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد افراد کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات ہے‘ لیکن اس کے لیے سازگار اجتماعی ماحول مہیا کرنے کی جِدّوجُہد کرنا بھی ان کے مقاصدِ بعثت اور فرائض ہائے منصبی میں شامل رہا ہے۔ عام انسان کی بات چھوڑیں‘ انبیاء اور رسلؑ نے بھی اپنے مشن کا آغاز تو تن تنہا کیا‘ لیکن حواریین اور صحابہ کرامؓ کی نصرت سے ہی اسے آگے بڑھایا۔ اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم رسولوںؑ میں سے حضرات موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے ایک طرف تو اپنی قوم بنی اسرائیل پر ہونے والے سیاسی جبر و استحصال کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی معجزانہ مدد کے نتیجے میں آزادی‘ کتاب و شریعت کے اُتارے جانے اور ایک جماعت فراہم ہو جانے کے بعد اس کے نفاذ کے لیے اپنی قوم سے اجتماعی جِدّوجُہد کا مطالبہ کیا۔ البتہ قوم کی بزدلی آڑے آئی‘ بات آگے نہ بڑھ سکی اور دین فوری طور پر نافذ نہ ہو سکا۔

اللہ کے آخری نبی اور رسول محمد مصطفیٰ ﷺ نے آ کر پہلی مرتبہ پوری انسانیت کو ایک محفوظ

کتاب قرآن مجید کے ذریعے ایک کامل دین کی طرف نہ صرف دعوت دی بلکہ اسے قبول کرنے والوں کی سمع و طاعت کے ٹھیٹھ اسلامی اُصول پر ایک مضبوط جماعت بھی بنائی۔ اِس جماعت نے مال و جان کی جس طرح قربانیاں دیں اور جس جان فشانی سے اِس مشن کے لیے وہ جُت گئے‘ انسانی تاریخ اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بالآخر فتح مکہ پر حضور ﷺ کے تکبیرِ رب کے اُس مشن کی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک تکمیل ہو گئی جس کا حکم آپؐ کو سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ شہادت علی الناس کا یہ فریضہ اپنی اُمّت کو منتقل کر کے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ) حضور ﷺ نے جو نظامِ عدل و قسط قائم کیا‘ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اُسے نہ صرف نکھارا بلکہ صرف تیس برس کے قلیل عرصے میں تین براعظموں تک پھیلا دیا۔ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر‘ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اختیار کردہ تعبیر کے مطابق‘ دینِ حق کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی چھ منزلہ عمارت کی صرف چھٹی منزل منہدم ہوئی۔ بقیہ پانچوں منزلوں کو ایک ایک کر کے گرنے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال لگے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ عمارت راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ یعنی مسلمانوں نے خود ادارۂ خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ع چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا!

اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ عمارت جو اپنوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں اور غیروں کی سازشوں سے زمین بوس ہو گئی تھی اُسے ازسرِنو کھڑا کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کیا رحمۃ للعالمین ﷺ کے دیے ہوئے اُس عادلانہ نظام کو ماضی کا قصہ سمجھ لیا جائے؟ ہماری نظر میں ایسا کرنا صرف اپنی دنیا اور آخرت تباہ و برباد کرنا ہی نہیں بلکہ انسانیت سے دشمنی کا مظہر بھی ہے۔ ایسا کرنا انسانیت کو آگ کے سمندر میں پھینکنے کے مترادف ہے۔ آج دنیا ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی اور انسانوں کو زندگی میں بے شمار سہولتیں فراہم کرنے کے باوجود جہنّم زار بنتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا اُس عادلانہ نظام کو واپس لائے بغیر چارہ نہیں!

عالَمِ اسلام کی حالت یہ ہے کہ ہر گزرتا دن مسلمانوں کی پسپائی اور ہزیمت کی داستان سنا رہا ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کا اب بالفعل وجود تو نہیں ہے‘ مختلف مسلمان ممالک ہیں‘ جہاں مغرب کا سیاسی اور معاشی نظام اپنا قبضہ مکمل کر چکا ہے۔ روشن خیالی کے ٹائٹل کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن بھی اپنی جگہ بڑی حد تک بنا چکی ہے۔ یہ ہمہ جہتی یلغار اتنی کامیابی سے سرایت کر گئی ہے کہ آج کے بعض نام نہاد مسلم دانشور اور مفکّر خود سیاسی اِسلام پر انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ ایسے سوال کھڑے کیے جا رہے

ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کی جِدّ وجُہد کسی اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں! یہ وہ دانشور ہیں جو ’’آسان اسلام‘‘ کے قائل ہیں۔ مثلاً سود لینا حرام اور ناجائز‘ لیکن دینا حلال اور جائز۔ وہ عورت کو اپنے تئیں ’’پردے کی جکڑ بندیوں‘‘ سے آزاد کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں جمہوری نظام کے حوالے سے پروفیسر فرانسس فوکو یاما کے فلسفہ End of History کے شدّت سے قائل ہیں۔ ہمیں ایسی دانش سے کچھ لینا دینا نہیں۔

البتہ دین سے انتہائی مخلص کچھ دانشور جو شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو من وعَن قبول کرتے ہیں اور اُس پر عمل پیرا بھی نظر آتے ہیں‘ ہم اُن کی علمی صلاحیتوں اور علمی کاوشوں کے دل کی گہرائیوں سے معترف ہیں اور اُنہیں بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں‘ لیکن حیرت اِس بات پر ہے کہ وہ اقامتِ دین کی جِدّ وجُہد اور اُس کے لیے منظّم جماعت کا قیام غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحبِ علم کے سامنے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے چند سوالات رکھے تھے‘ جن کا ہم قارئین کے سامنے اعادہ کیے دیتے ہیں۔ پہلا سوال یہ تھا کہ: اگر کسی ملک کی آبادی کی عظیم اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو تو اُس ملک میں کون سا نظام رائج ہونا چاہیے: اِسلامی نظام یا کوئی دوسرا نظام؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ: اگر بدقسمتی سے وہاں اسلامی نظام قائم نہیں بلکہ غیروں کا نظام نافذ ہے تو مسلمان باشندوں کو اِسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے یا نہیں؟ کیا یہ کوشش ہر مسلمان انفرادی طور پر اپنے تئیں کرتا رہے یا اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی منظّم جماعت کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے ہر ذی شعور ہی نہیں ذی ہوش بھی یہ کہے گا کہ مسلمانوں کو ایک منظّم جماعت بنا کر اِسلامی نظام کے قیام کی جِدّ وجُہد کرنا چاہیے۔ یہی جواب اُن صاحبِ علم نے بھی دیا تھا۔ ہم اِس میں یہ اضافہ کیے دیتے ہیں کہ اگر یہ اِسلامی ملک پاکستان ہو تو بات اخلاقی ہی نہیں دینی سطح پر مزید مؤکد ہو جاتی ہے‘ کیونکہ مسلمانانِ پاکستان نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اُنہیں ایک علیحدہ خطۂ زمین عطا فرما دے تو وہ اُس میں اللہ کا دین نافذ کریں گے۔ جہاں تک اِس مقصد کے حصول کے لیے جماعت کی ضرورت و اہمیت کی بات ہے تو اگر ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلۂ رسالت پر نظر ڈالی جائے اور دوسری طرف اُنیسویں اور بیسویں صدی میں سائنسی ترقی اور صنعتی وثقافتی انقلابات کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارتقائے زمانہ کے نتیجے میں انفرادیت کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی اہمیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا آج اجتماعیت کی ناگزیریت پہلے سے کہیں زیادہ عیاں ہو رہی ہے۔ دینِ اسلام کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ دو افراد کو بھی سفر اور نماز میں

جماعت کی صورت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔

جماعت سازی کے حوالے سے کچھ اندیشوں کا بڑی شدّت سے اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس سے جماعتی وگروہی عصبیت کی لعنت اور شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ کون سا بڑا کام ہے جو اندیشوں سے خالی ہوتا ہے۔ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اُس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس کے اندیشوں سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔

’’شخصیت پرستی‘‘ کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں صرف کسی ایک داعی کے اپنے خیالات‘ نظریات وتصوّرات اور اسی کے فہم وفکر کو ہی اس اجتماعیت میں ایک ایسے مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہو جائے جس پر کبھی کوئی سوال ہی نہ اُٹھایا جا سکے۔ اس کے برعکس اگر بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق پر غور کرتے رہیں اور مسلسل ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاء اللہ اس اندیشے کا سدّباب ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ دین کی خدمت کے لیے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اِنَّنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کے مطابق اپنے آپ کو اُمّتِ مسلمہ ہی کا ایک حصہ تصوّر کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور وگھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے ’’چیزے دگر‘‘ ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر وبرتر تصوّر کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ تفرقہ بازی محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی اس کا سبب بن سکتا ہے۔ درس گاہوں نے جہاں اسلامی تعلیمات عام کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے وہاں یہ بھی ہوا کہ دین اسلام کو اپنے مسلک تک محدود کرنے کا طرزِ عمل سامنے آیا جو ’’من دیگرم تو دیگری‘‘ کی بنیاد بنا۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے ہی بند کر دیے جائیں اور نہ ہی یہ درست ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے اُمّت میں تفرقہ و انتشار پیدا نہ ہو۔

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے ’’داخلی انتشار‘‘ کا ہے۔ اختلاف اس عالَم واقعہ کی ایک عظیم اگرچہ تلخ حقیقت ہے۔ تحریکیں اُٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں‘ پھر ان میں داخلی انتشار رونما

ہوجاتا ہے۔اسی طرح مدارس میں باہمی سرپھٹول کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیا ہوجاتا ہے۔ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں۔لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔اختلافات کے حل کے لیے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں اور جہاں اختلاف نصوص اور بنیادی معاملات کا نہ ہو بلکہ صرف رائے اور تعبیر وتشریح کا ہو‘ تو جماعت کے نظم بالا کی رائے اور تشریح کو فوقیت دی جائے۔اس کے بعد بھی کوئی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

ہمارے نزدیک احیائے اسلام کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں‘ جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرِکار ہیں۔مثلاً تعلیمی وتدریسی‘ اصلاحی و تربیتی‘ تبلیغی ودعوتی‘ قومی وملّی اور انقلابی و احیائی‘ جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اِس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔ستم ظریفی یہ ہے کہ دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے عَلم بردار تو پوری طرح منظّم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں‘ لیکن دینِ حق کے ماننے والے ابھی اِس بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ دینِ متین کے لیے اجتماعی جِدّوجُہد ضروری ہے یا نہیں! یہاں ایک فرمانِ رسول ﷺ کا حوالہ دینا اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچاتا ہے:

((اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

’’میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں‘ جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: الجماعت میں رہنا‘ سمع (سننا)‘ اطاعت کرنا‘ (دارالاسلام کی طرف) ہجرت کرنا‘ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔(مسند احمد‘ ترمذی‘ نسائی)

(نوٹ: اِس تحریر میں بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے کتابچہ ’’تعارفِ تنظیم اسلامی‘‘ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔)

❁❁❁

معاہداتِ امن اور مسلم اُمّہ کا کردار

شجاع الدین شیخ‘ امیر تنظیم اسلامی

امریکی صدر ٹرمپ نے نیٹو کے سربراہی اجلاس میں کہا کہ امریکہ اور ایران کے تعلقات میں گزشتہ کئی عشروں سے جاری کشیدگی میں اب کمی ہوگی۔اِس کے علاوہ اُنہوں نے ایران پر امریکہ کی جانب سے عائد پابندیوں میں نرمی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ تعمیرنو کے لیے تہران تیل برآمد کر سکے گا اور ساتھ ہی یہ توقع بھی ظاہر کی ہے کہ ایران اور امریکہ میں مذاکرات جلد شروع ہو سکتے ہیں‘ تاہم ایرانی جوہری پروگرام پر معاہدہ بھی زیرِغور ہے۔ہیگ میں جاری نیٹو سربراہی اجلاس کے موقع پر خطاب میں انہوں نے کہا ہے کہ ہم ایران کو کسی صورت ایٹمی طاقت نہیں بننے دیں گے اور اگر اس نے یورینیم افزودگی کا پروگرام دوبارہ شروع کیا تو اس پر دوبارہ حملہ کریں گے۔اِس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ امریکی صدر نے جب سے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا ہے‘ دنیا بھر میں کہیں جنگیں شروع ہو رہی ہیں تو کہیں اعلانِ جنگ بندی ہو رہا ہے‘ حالانکہ اُنہوں نے تو حلف اُٹھانے سے پہلے بلکہ اپنی انتخابی مہم کے دوران ہی یہ کہا تھا:’’سب سے پہلے امریکہ‘‘ یعنی امریکہ اب کسی دوسرے ملک میں مداخلت نہیں کرے گا۔گویا جو ہونا تھا وہ ہو چکا‘ اب مزید جنگیں نہیں ہوں گی۔دنیا حیران تھی کہ امریکہ اب اگر تیسری دنیا کے ممالک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا! جس وقت ڈونلڈ ٹرمپ کو امریکی صدر منتخب کیا جا رہا تھا‘ غزہ میں تازہ ترین اسرائیلی مظالم کو شروع ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔اہلِ غزہ اپنے بل بوتے پر مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھے جس کے جواب میں اسرائیل فلسطین میں نسل کشی میں مصروف تھا۔اِس دوران میں نصف لاکھ سے زیادہ بے گناہ مسلمان بچے‘ خواتین‘ نوجوان اور بزرگ شہید کیے جا چکے تھے۔پورے غزہ میں کوئی ایک خاندان بھی ایسا نہیں تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اُس مزاحمت کے دوران شہید نہ ہوا ہو۔اپنے

دعوے کے پیشِ نظر تو ٹرمپ صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ اسرائیل سے کہتے کہ چونکہ اب میں دنیا میں امن قائم کرنا چاہتا ہوں‘ اس لیے تم فلسطین کے وہ تمام علاقے خالی کر دو جن پر تم نے گزشتہ سالوں میں قبضہ کیا ہے تاکہ اہلِ غزہ سکون سے زندگی بسر کر سکیں‘ مگر ایسا نہیں ہوا۔

امریکی صدر کے حلف اٹھانے سے صرف ایک دن پہلے اہلِ غزہ اور اسرائیل کے درمیان عارضی جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تو اس پر مسلم دنیا میں خوشی کی لہر پھیل گئی۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ ٹرمپ صاحب نے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی اتنا بڑا کام کر دیا ہے تو بعد میں کیا کچھ نہیں کریں گے۔ عہدہ سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد روس اور یوکرین کی جنگ کا موضوع زیر بحث آیا تو صدر ٹرمپ نے یوکرین کے صدر ولادی میر زیلنسکی سے کہا: ’’اب روس کے ساتھ اگر جنگ جاری رکھنی ہے تو اپنے بل بوتے پر لڑیں‘ امریکہ اب ’’مزید‘‘ مدد نہیں کرے گا۔‘‘ یوکرین کے صدر اور صدر ٹرمپ کی ملاقاتوں اور ہدایات پر تبصرے ابھی زیر بحث تھے کہ اسرائیل نے امن معاہدہ توڑتے ہوئے اہلِ غزہ پر تاریخ کی بدترین بمباری کی۔ ایسے میں ٹرمپ صاحب نے اہلِ غزہ سے ’’اظہارِ ہمدردی‘‘ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ علاقہ کو خالی کر کے دوسرے علاقوں میں چلے جائیں۔ گویا امن قائم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اہلِ غزہ وہ بات مان لیں جس کی وہ گزشتہ کئی سالوں سے مزاحمت کر رہے ہیں۔

اِس دوران میں غزہ میں بدترین غذائی قلت پیدا ہو گئی تو پاکستان سمیت کئی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کئی مسلم ممالک کے عوام پاکستان کی طرف پُراُمید نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ اسرائیل کو منہ توڑ جواب دے۔ پھر پاکستان کی تمام دینی جماعتوں نے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر اسرائیل کے خلاف جنگ کا فتویٰ دے دیا جس سے حکومتِ پاکستان کو بھی پریشانی لاحق ہوئی۔ اِس پریشانی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پاکستان کو مصروف کرنے کے لیے بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا مگر افواجِ پاکستان کی جوابی کارروائی سے بھارت بھی بوکھلا گیا اور چند گھنٹوں میں ہی سفید جھنڈے لہرا دیے۔ اِس ’’جنگ بندی‘‘ کا کریڈٹ بھی صدر ٹرمپ نے ’’حاصل‘‘ کیا۔ اِس کے بعد ابھی بھارت اپنے نقصانات کا جائزہ ہی لے رہا تھا تو یوکرین نے روس پر فضائی حملے کر دیے جس میں روس کو بڑا نقصان پہنچانے کے دعوے کیے گئے مگر روس نے بھی جوابی حملے کر کے یوکرین کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس جنگ میں بھی صدر

ٹرمپ کے جنگ بندی کرانے کے دعوے کی گونج سنائی دیتی رہی۔

پھر پاکستان اور بھارت نے الگ الگ وفود امریکہ اور یورپ بھیجے تاکہ دنیا کے سامنے اپنا اپنا موقف بیان کریں۔ پاکستانی وفد نے اپنا پیغام صدر ٹرمپ تک پہنچاتے ہوئے کہا کہ وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان مصالحت کرانے میں اپنا کردار ادا کریں‘ جس پر ہم نے تبصرہ کیا تھا کہ صدر ٹرمپ کا مصالحت میں کردار دو بلیوں میں کیک کی تقسیم کرنے والے کی طرح کا ہی ہو سکتا ہے۔ بھارتی وزیر اعظم نے امریکی صدر کی مداخلت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسی دوران میں اسرائیل نے ایران پر حملہ کر کے اس کے چوٹی کے قائدین کے علاوہ ایٹمی سائنس دان بھی شہید کر دیے۔ ایران نے جب اسرائیل پر جوابی حملے کیے تو اسرائیلی عوام کو وہ تمام مناظر دیکھنے کو ملے جو گزشتہ ڈیڑھ برس سے نہتے اہلِ غزہ دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ اسرائیلی عوام اور حکومت دونوں کے لیے یہ صورت حال غیر متوقع تھی۔ ایسے میں جب اس نے امریکہ سے مدد طلب کی تو بادل نخواستہ اُس نے ایران پر کچھ اس طرح سے حملہ کیا کہ لاٹھی بھی ٹوٹ گئی اور سانپ بھی نہیں مرا۔ آخر کار امریکہ اور اُس کے ایجنٹ اسرائیل نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا جسے ایران نے اس شرط پر قبول کر لیا ہے کہ آئندہ شرارت نہیں کرنا۔ اس وقت ایران کا ایک معمولی شرط پر جنگ بندی پر راضی ہونا یقیناً اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس نے امریکہ اور اسرائیل پر یہ واضح کر دیا ہے کہ اب اگر کوئی شرارت ہوئی تو کم از کم اسرائیل تو ایسا مزہ ضرور چکھ لے گا کہ وہ اس کا ذائقہ بتانے کے قابل نہیں ہو گا۔

ادھر غزہ میں اسرائیل کو جتنی بھی ہزیمت اُٹھانا پڑی ہے‘ اس میں ایران کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ہاتھ قانونی طور پر تو یقیناً کسی کو نظر نہیں آیا مگر اِس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسے میں ایران کو اسرائیل کے خلاف جنگ بندی یقیناً اس شرط پر ہی کرنی چاہیے تھی کہ اسرائیل فلسطین سے اپنی فوجیں نکال کر ۱۹۶۷ء والی پوزیشن پر لے جائے۔ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ خطے میں دو اسلامی ممالک اپنے پڑوسی ہنود اور یہود سے جنگ جیت چکے ہیں جبکہ افغانستان پہلے ہی امریکہ اور روس کو شکست دے چکا ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ یہ تینوں ممالک مل کر بیت المقدس کی آزادی اور عالم اسلام کی رہنمائی کے لیے کسی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر کوئی لائحہ عمل طے کریں تاکہ دین کی سربلندی کے کام کا آغاز ہو سکے۔ ۞۞

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ (۴)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

توحید فی العبادۃ اور توحید فی الاستعانہ

سورۂ فاتحہ کی سات آیات میں سے ساڑھے تین آیات اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تمجید پر مشتمل ہیں' اور ان کا منطقی نتیجہ نکلتا ہے ''توحید فی العبادت۔'' ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ پروردگار سے ایک بہت بڑا عہد ہے کہ ''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔'' امر واقعہ ہے کہ یہ کہتے ہوئے اگر ع ''چومی گویم مسلمانم بلرزم!'' کی کیفیت کو مدِّنظر رکھا جائے تو چوتھی آیت کے دوسرے ٹکڑے سے اس کا ربط واضح ہوجائے گا۔ جیسے ہی انسان یہ کہے ''اِيَّاكَ نَعۡبُدُ'' تو ساتھ ہی اس کی دل جوئی اور تسلی کا پیغام موجود ہے ''اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ'' یعنی اے ہمارے ربّ! ہم یہ اتنا بڑا عہد اور قول وقرار اپنے زورِ بازو پر نہیں کر رہے ہیں' بلکہ اس میں ہم تیری تائید اور توفیق کے محتاج ہیں۔ چنانچہ یہی ہے وہ رمز نبی کریم ﷺ کی اس دعائے ماثورہ میں جو کہ آپؐ ہر نماز کے بعد مانگا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیۡ عَلٰی ذِکۡرِکَ وَ شُکۡرِکَ وَ حُسۡنِ عِبَادَتِکَ)) ''اے اللہ! میری مدد فرما اس پر کہ مَیں تجھے یاد رکھ سکوں (جیسا کہ تجھے یاد کرنے کا حق ہے)' تیرا شکر ادا کرسکوں (جیسا کہ تیرے شکر کا حق ہے) اور حسن وخوبی کے ساتھ تیری بندگی کرسکوں (جیسا کہ تیری بندگی کا حق ہے)۔''

اس چوتھی آیت میں بھی ایک خاص اسلوب سے شرک کا سدِباب کیا گیا ہے۔ اگر اسلوب یہ ہوتا کہ نَعۡبُدُکَ وَنَسۡتَعِيۡنُکَ تو اس کے معنی ہوتے کہ ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اس میں غیر کی بندگی کی نفی نہ ہوتی۔ اسی طرح ہم تجھ سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے' اس میں غیر سے استعانت کی نفی نہ ہوتی۔ عربی زبان میں ضمیر مفعولی کو

پہلے لاکر حصر کا ایک مفہوم پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ''نَعۡبُدُکَ'' نہیں کہا' بلکہ فرمایا: ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔'' یہاں شرک کا سدِّباب ہوا اور توحید پر زور آیا۔ یہ ہے توحید فی العبادۃ۔ ﴿وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ ''اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔'' یہ ہے توحید فی الاستعانت۔

توحید فی العبادۃ کے ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ توحید کے دو رُخ معیّن کیے گئے ہیں۔ ایک ہے توحید فی العقیدہ۔ اس کو آپ کہہ سکتے ہیں نظریاتی توحید' علمی توحید۔ یعنی اللہ ایک ہے' اللہ تنہا ہے' اللہ کا کوئی ساجھی نہیں ہے' اللہ کا کوئی مدّمقابل نہیں ہے' اللہ جیسا کوئی نہیں ہے' اللہ کی صفات میں اُس کا کوئی مثل نہیں ہے۔ یہ علمی انداز میں توحید کا اظہار ہے۔ توحید کا دوسرا رُخ ہے توحید فی الطلب۔ یعنی مطلوب ومقصود اور معبود صرف اور صرف وہی ہے۔ درحقیقت پہلی آیت ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝﴾ توحید فی العقیدہ یا علمی اور نظری توحید کے ضمن میں اصل الاصول ہے' جڑ اور بنیاد ہے جب کہ ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ توحید فی الطلب یا عملی توحید کا اقرار ہے کہ اُسی کی اطاعت ہوگی' مطاعِ مطلق صرف وہی ہے۔ مخلوق کی اطاعت اُس کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہوگی۔ محبوبِ حقیقی وہی ہے اور سب مخلوق کے لیے محبت اُس کی محبت کے تابع ہوگی۔ مطلوبِ اصلی وہی ہے' باقی سب کی حیثیت ذرائع کی ہوگی' مقصود کی نہیں۔ یہ ہے درحقیقت توحید فی الطلب یا توحید فی العبادۃ' یا اس کو عملی توحید کہیے' جو اس ٹکڑے کے اندر مکمل طور پر آجاتی ہے ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق ایک لفظ ''عبادت'' میں آجاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الۡعِبَادَۃِ))[۳۳] ''دُعا عبادت کا مغز اور لُبِّ لُباب ہے'' اور ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الۡعِبَادَۃُ))[۳۴] ''دُعا ہی تو عبادت ہے۔''

اسی آیت کا دوسرا ٹکڑا ہے: ﴿وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝﴾۔ اس میں توحید فی الدعاء' توحید فی الاستعانہ' توحید فی الاستمداد سب جمع ہوگیا۔ یہ مختلف الفاظ ہیں جو باب استفعال سے آتے ہیں: استعانت' استنصار' استمداد' استدعاء' استغاثہ۔ استغاثہ سوائے اللہ کے کسی

اور سے نہیں ہوگا۔ استعانت سوائے اللہ کے کسی اور سے نہیں ہوگی۔ استدعا سوائے اُس کے کسی اور سے نہیں ہوگی۔ استمداد سوائے اُس کے کسی اور سے نہیں ہوگی۔ مَیں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ اس میں اصلاً مراد ہے فوق الاسباب‘ کسی سے تعاون کی درخواست کرنا۔ ایک ہے مادّی قانون کے اندر اور تحت الاسباب کسی سے مدد طلب کرنا‘ یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ وہاں گھڑا رکھا ہے اور پانی بھی ہے‘ مَیں نے کسی سے کہا کہ ذرا مجھے پانی پلادو‘ یہ بھی استعانت ہے‘ استمداد ہے۔ مَیں نے کسی سے مدد چاہی ہے‘ اُس نے میری ایک ضرورت پوری کی ہے‘ اس کے لیے مَیں اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں‘ لیکن مادّی اسباب و وسائل اور ظاہری اسباب وعلل کے اندر امداد اور استعانت طلب کرنا مختلف شے ہے‘ جبکہ ماوراء الاسباب‘ کوئی غیر محسوس طریقے پر‘ مادّی طریقوں سے بلند تر کسی سلسلہ میں کسی سے مدد طلب کرنا‘ کسی سے استغاثہ کرنا‘ کسی کو پکارنا‘ کسی سے دعا کرنا‘ یہ بالکل دوسری شے ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی سے استمداد ہے‘ کسی سے استعانت ہے‘ کسی سے استدعا ہے‘ کسی سے استغاثہ ہے تو وہ شرک ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

تاہم اسبابِ ظاہری کے اندر کسی سے امداد طلب کرنے میں شرکِ خفی پیدا ہوسکتا ہے‘ اگر انسان کے ذہن پر یہ چیز مسلط ہوجائے کہ کسی شخص میں اپنے طور پر یہ طاقت موجود ہے کہ میری ضرورت پوری کرسکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن سے اوجھل ہوجائے کہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (کسی میں کوئی طاقت نہیں ہے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو)۔ مَیں نے اسے کہا ہے کہ مجھے پانی پلادے‘ یہ مجھے پانی پلاسکتا ہے جب اللہ چاہے گا‘ محض اپنے ارادے اور طاقت سے یہ مجھے پانی بھی نہیں پلاسکتا۔ اگر یہ چیز ذہن سے اوجھل ہوجائے گی تو یہ شرکِ خفی ہوجائے گا۔ البتہ اسبابِ ظاہری سے ماورا ہوکر کسی سے مدد طلب کرنا تو شرکِ جلی ہے‘ اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

حصّہ سوم (درخواستِ ہدایت) کی تفہیم

سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصّہ اگرچہ آخری تین آیات پر مشتمل ہے‘ تاہم یہ تینوں آیات

مل کر ایک جملہ بنتی ہیں۔ اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک عام بات کے بعد اب خاص بات کا ذکر آرہا ہے۔ استعانت عام ہے: اے ربّ! ہم تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔ مدد تو ایک عام لفظ ہے‘ اس مدد کے ضمن میں جو خاص اور اہم ترین چیز ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں ہدایت عطا فرما: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ پروردگار! ہم سب سے بڑھ کر جس چیز کے محتاج ہیں وہ ہدایت ہے۔

ہدایت: عظیم ترین نعمتِ خداوندی

سورۂ فاتحہ کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں سب سے پہلا نکتہ تو ذہن میں یہ رکھیے کہ بندے کو اپنے ربّ کے حضور حاضری کی نعمت میسر آئی۔ یہ میری اور آپ کی نماز نہیں‘ اُس بندے کی ہے جو واقعتاً ''عبداللہ'' ہو‘ جو کہہ سکے: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ‘ جو فی الواقع ''عبدہٗ'' ہو۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر!

اس کا تصور کیجیے‘ وہ ربّ کے حضور میں حاضر ہے اور وہ کیفیت ذہن میں لائیے: ''اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ''[۳۵]۔ اس وقت وہ معناً معراج کی لذت سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ یہاں پر دیکھیے کہ اُس نے مانگا کیا ہے! گویا تلقین ہو رہی ہے کہ مانگنے کی اصل شے کیا ہے! ایک ہے ہماری ذہنی سطح تو ہم دنیاوی نعمتیں طلب کریں گے۔ میرے ایک دوست جو امریکہ جا رہے تھے‘ انہوں نے اپنی چھوٹی بچی سے پوچھا: بیٹی! مَیں تمہارے لیے وہاں سے کیا لاؤں؟ اُس نے اپنی ذہنی سطح کے مطابق کہا کہ میرے لیے وہاں سے ایک پنسل لے کر آئیے گا۔ اس لیے کہ اس کی ذہنی سطح ہے ہی اتنی‘ اس سے بالاتر چیز کا ابھی تک اس کے ذہن میں تصوّر نہیں ہے۔ تو ہر کوئی اپنی ذہن کی سطح کے مطابق ہی مانگتا ہے۔

اگر ہمیں وہ لمحہ میسّر آجائے تو ہم کیا مانگیں گے؟ ہماری نگاہ میں کس چیز کی قدر و منزلت ہوگی؟ شاید دولت مانگیں‘ ثروت مانگیں‘ شہرت طلب کریں‘ دنیاوی حیثیت و وجاہت طلب کریں‘ دنیاوی غلبہ واقتدار طلب کریں۔ یہاں تلقین ہو رہی ہے کہ مانگنے کی

اصل شے ’’ہدایت‘‘ ہے۔ درحقیقت رہنمائی ہو رہی ہے کہ اس پوری کائنات میں کوئی چیز اُس وقت تک نعمت نہیں ہے جب تک کہ اُس کے ساتھ نعمتِ ہدایت شامل نہ ہو۔ جن چیزوں کو تم نعمت سمجھے ہوئے ہو اگر ہدایت نہ ہو وہ تو موجبِ زحمت بن جائیں گی۔ مثلاً دولت ہے‘ ہدایت نصیب نہیں ہے تو دولت سے آپ کیا کریں گے؟ عیاشیاں کریں گے‘ بدمعاشیاں کریں گے‘ اس دولت کو لوگوں پر رعب گانٹھنے کا ذریعہ بنائیں گے۔ چنانچہ یہ دولت بذاتِ خود نعمت نہیں بلکہ موجبِ زحمت ہے‘ موجبِ عذاب ہے۔ اولاد ہے لیکن ہدایت نہیں ہے تو آپ اولاد کو کیا بنا کر اٹھائیں گے؟ اولاد سرکش بن کر اٹھے گی‘ خدا کی باغی بن کر اُٹھے گی۔ یہ اولاد آپ کے لیے صدقہ جاریہ نہیں ہوگی۔ یہ آپ کے نامہ اعمال میں ہمیشہ ہمیش کے لیے گناہوں کے مزید اندراج کا ذریعہ اور سبب بن جائے گی۔ معلوم ہوا کہ مجرد اولاد نعمت نہیں ہے۔ ہاں! نعمتِ ہدایت ہو تو پھر اولاد بھی نعمت ہے۔ اتنی بڑی نعمت ہے کہ جلیل القدر پیغمبروں نے اس کے لیے دعائیں کیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے دُعا کی: ﴿رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ ﴿۸۹﴾﴾ (الانبیاء) ’’پروردگار! مجھے اکیلا مت چھوڑنا‘ اور تُو سب سے بہتر وارث ہے۔‘‘ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی‘ اور جب اسماعیل واسحاق علیہما السلام جیسے بیٹے ملے ہیں تو ہدیہ تشکر پیش کیا ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾﴾ (ابراھیم) ’’کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے عطا فرمائے باوجود بڑھاپے کے اسماعیل واسحٰق (جیسے بیٹے)۔ بے شک میرا ربّ دعائیں سننے والا ہے۔‘‘ اس آیت کے آخری ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعائیں مانگ مانگ کر اولاد لی‘ تو اسی پر آپ قیاس کر لیں کہ جتنی نعمتیں ہیں‘ وہ فی نفسہٖ نعمت نہیں ہیں۔ اصل نعمت‘ نعمتِ ہدایت ہے جو ہر چیز کو نعمت بنا دیتی ہے‘ اور اگر وہ نہیں ہے تو ہر چیز نعمت نہیں بلکہ موجبِ زحمت ہو جائے گی۔ لہٰذا مانگنے کی اصل چیز ہدایت ہے۔

صراطِ مستقیم کی پہچان: وحیٔ الٰہی کی محتاج

سورۃ الفاتحہ میں مضامین کا یہ ربط ہم ملاحظہ کر چکے ہیں کہ ایک سلیم الفطرت انسان عقل سلیم کی رہنمائی میں‘ غور و فکر کے نتیجے میں یہاں تک تو از خود پہنچ جاتا ہے۔ آگے ہے اصل میں وہ بات کہ جہاں انسان گھٹنے ٹیک کر سوال کرنے پر مجبور ہے‘ اور وہ ہے اس زندگی کے پُرپیچ سفر میں سیدھی شاہراہ ’’صراطِ مستقیم‘‘ جو پُرپیچ نہ ہو‘ جس میں افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں‘ جس میں اِدھر اُدھر کا بھٹکنا نہ ہو۔ اس کا تعلق عقل انسانی کے امکان میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے ظروف و احوال سے بلند نہیں ہو سکتا۔ مرد ہے تو بحیثیت مرد سوچے گا‘ وہ اپنے آپ کو عورت کی جگہ پر رکھ کر نہیں سوچے گا۔ اُس کے اپنے احساسات ہیں‘ اُس کی اپنی نفسیاتی ساخت ہے۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں:

He will stay inside his skin and will not come out

یعنی وہ اپنی چمڑی کے اندر ہی رہے گا‘ اس سے باہر تو نہیں آئے گا۔ لہٰذا وہ جو نظام تجویز کرے گا اس میں عورت کے لیے صحیح صحیح اور معتدل مقام کا تعین کرنا ناممکن ہے‘ یا اِدھر ٹھوکر کھائے گا یا اُدھر ٹھوکر کھائے گا۔ کسی مزدور کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کارخانہ دار کی جگہ ہو کر سوچ سکے۔ اُس کے اپنے مسائل (problems) ہیں‘ وہ اُن تلخ حقیقتوں کو خوب جانتا ہے جو اُسے درپیش ہیں اور اُنہی میں الجھا ہوا ہے۔ وہ کارخانہ دار کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتا‘ جب کہ کارخانہ دار کے ذہن پر اپنے مسائل مسلط ہیں۔ وہ محسوس نہیں کر سکتا کہ ایک غریب مزدور کے احساسات کیا ہیں! اب ظاہر بات ہے انسان اِدھر ہوگا یا اُدھر ہوگا۔ مرد ہوگا یا وہ عورت ہوگی‘ یا وہ مزدور ہوگا یا کارخانہ دار ہوگا‘ یا وہ کاشت کار ہوگا یا زمیندار ہوگا‘ یا وہ حکومت میں ہوگا یا اُس پر حکومت کی جا رہی ہوگی۔ انسان مختلف حیثیتوں میں رہتے ہوئے غور کرتا ہے‘ سوچتا ہے تو لازماً افراط و تفریط میں مبتلا ہوتا ہے۔

ان پیچیدہ مسائل میں مَیں نے تین چیزیں گنوائی تھیں‘ اور یہ تین تقریباً عقدہ ہائے لاینحل ہیں: (۱) مرد اور عورت کے درمیان توازن‘ (۲) فرد اور اجتماعیت کے مابین توازن‘ (۳) سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن۔ یہ سرمائے اور محنت ہی کی ایک شکل ہے کہ کوئی زمیندار ہے اور کوئی کاشت کار۔ دوسری شکل یہ ہے کہ یہ کارخانہ دار ہے اور یہ مزدور ہے۔ اس تیسرے مسئلہ کو صنعتی انقلاب (industrial revolution) اور مشین

کی ایجاد نے اتنا گمبھیر بنا دیا ہے کہ اس کا حل کسی کے پاس نہیں۔ یا تو انسان ایک انتہا پر سرمایہ داری (Capitalism) کی طرف چلا جائے گا‘ یا دوسری طرف چھلانگ لگائے گا تو اسے سوائے کمیونزم کے کوئی راستہ نظر نہیں آئے گا۔ یہ ہیں وہ دھکے جو نوعِ انسانی کھا رہی ہے اور ان میں انسان کی اصل ضرورت ’’صراطِ مستقیم‘‘ ہے۔

یہ جان لیجیے کہ نبوت و رسالت کی ضرورت کیوں ہے! توحید تک تو انسان خود پہنچ سکتا ہے‘ آخرت تک بھی اُس کی رسائی ہے‘ البتہ ان چیزوں میں زیادہ یقین کی گہرائی نبوت و رسالت سے میسر آتی ہے۔ اصلاً یہ چیزیں اُس کے اپنے ذہن کے دائرے میں بھی ہیں‘ لیکن گیرائی اور گہرائی میں اضافہ ہوگا تو نبوت اور رسالت کے ذریعہ سے۔ البتہ جہاں وہ نبوت و رسالت اور وحی کا بالکلیہ محتاج ہے وہ ہے ’’صراطِ مستقیم‘‘۔ اس کے لیے قرآن مجید میں مختلف الفاظ آئے ہیں: الصِّرَاطِ السَّوِيِّ (طٰہٰ:۱۳۵) ’’بالکل درمیانی راستہ‘‘۔ خطِ استوا ہم اُس فرضی خط کو کہتے ہیں جو کُرۂ ارضی کو بالکل برابر دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اسی طرح سَوَاءَ السَّبِيْلِ (المائدۃ:۱۲) ’’توسط اور اعتدال کی شاہراہ‘‘ اور قَصْدُ السَّبِيْلِ (النحل:۹) ’’سیدھا راستہ‘ بیچ کی راہ‘‘ یہ مختلف اصطلاحات ہیں جو ایک حقیقت کو نمایاں کر رہی ہیں کہ انسان اس زندگی میں قدم قدم پر دوراہوں‘ سہ راہوں‘ چوراہوں پر آتا ہے‘ اور اگر اُس نے ہدایتِ خداوندی کا دامن نہ تھاما ہوا ہو تو کہیں وہ غلط موڑ مڑ جائے گا۔ ابتدا میں تو معلوم ہوگا کہ کوئی خاص فرق نہیں‘ محض دس ڈگری کا فرق ہے ان دونوں راستوں میں‘ لیکن آگے بڑھتے جائیں گے تو وہ راستہ کھلتا چلا جائے گا اور اصل راستہ دور ہوتا جائے گا۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جب معلوم ہوگا کہ بہت دور نکل آئے تو پھر انسان ایک ردِّعمل کے طور پر زور لگائے گا جس سے ہوسکتا ہے کہ کسی دوسری انتہا کو پہنچ جائے۔

حضورِ اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ باقاعدہ ڈایاگرام (نقشہ) بنا کر صحابہ کرامؓ کو

صراطِ مستقیم کی حقیقت سمجھائی۔ آپؐ نے زمین پر تنکے سے ایک سیدھا خط کھینچا اور کچھ آڑے ترچھے خطوط‘ جو اس سیدھے خط کو کاٹ رہے تھے۔ ایک خط بائیں طرف سے آیا اور وہ سیدھے خط کو کاٹتا ہوا دائیں طرف گزر گیا‘ پھر دائیں طرف سے آیا اور سیدھے خط کو کاٹتا ہوا بائیں طرف نکل گیا۔ پھر یہ بائیں والا خط لوٹا اور سیدھے خط کو کاٹ کر دائیں طرف نکل گیا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے کہ اس ڈایاگرام میں حضورِ اکرم ﷺ نے ایک عظیم حقیقت کو واضح کیا ہے کہ فطرتِ انسانی ’’سواء السبیل‘‘ کی طرف زور تو لگاتی ہے لیکن اس جگہ آ کر رکتی نہیں بلکہ اس کو عبور کر جاتی ہے‘ کیونکہ راہنمائی کا دامن ہاتھ میں نہیں ہے کہ معلوم ہو جائے کہ اب یہاں سے اپنا رخ درست کرنا ہے۔ اپنے زور میں پھر وہیں سے لوٹتی ہے کہ بہت غلط آ گئے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں!

اس کو میں ایک لفظ کے حوالے سے بیان کیا کرتا ہوں۔ ’’آزادی‘‘ ایک اعلیٰ قدر ہے‘ ہم سب مانتے ہیں۔ آج سے کوئی تین سو برس پہلے پوری دنیا میں جاگیرداری نظام (feudal system) تھا‘ جس میں انسان انتہائی پستی میں مبتلا تھے۔ نہ اُن کے حقوق تھے نہ اختیارات۔ بادشاہ تھا اور اس کے نیچے جاگیردار تھے۔ تیس ہزاری‘ بیس ہزاری منصب دار تھے۔ ہر جگہ لارڈز اور بیرنز تھے۔ پوری دنیا میں‘ مشرق اور مغرب میں‘ ہر جگہ یہی کچھ تھا۔ عوام کی حیثیت ان جاگیرداروں کے مقابلے میں کمی کاری‘ خدمت گزاروں کی تھی۔ جب انسانوں میں وہ شعور پیدا ہوا جس کو علامہ اقبال نے ’’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ‘‘ میں ابلیس سے کہلوایا ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خودشناس و خودنگر

جب یہ احساس پیدا ہوا کہ آخر یہ بھی ہماری طرح دو ہاتھ دو پاؤں رکھنے والے انسان ہیں‘ ہم اِن سے کس طرح کمتر تو نہیں کہ ان کے سامنے پست اور مطیع ہو کر رہیں۔ یہ شعور پیدا ہوا تو نوعِ انسانی نے آزادی کی تلاش میں سفر کا آغاز کیا۔ انقلابِ فرانس انسانی

تاریخ میں ایک بہت بڑا نشانِ راہ ہے۔ جمہوریت اور آزادی کے دور کا آغاز ہوا‘ لیکن اس آزادی میں ایک عدم توازن شامل ہو گیا۔ دولت کے سلسلے میں بھی آزادی کہ میرا پیسہ ہے‘ مَیں جو چاہوں کروں۔ وہی آزادی جو سیاست کے میدان میں انسان کو خود اختیاری اور جمہوریت کی طرف لے گئی‘ وہی آزادی معاشی معاملات میں سرمایہ داری کی طرف لے گئی۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا کہ ہم تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔ ع ’’رُست از یک بند تا افتاد دَر بندے دگر!‘‘ جاگیردار کی غلامی سے نکلے تھے‘ سرمایہ دار کی غلامی میں مبتلا ہو گئے۔ وہ آزادی کی چڑیا تو ہاتھ نہ آئی۔ اب پھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ایک ردِّعمل ہوا جس کی انتہا کمیونزم ہے۔ کسی کا کچھ نہیں ہے۔ سرمایہ اور سرمایہ پیدا کرنے والے ذرائع کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں‘ بلکہ اجتماعی ملکیت میں ہونے چاہئیں۔ ہے وہی آزادی کی تڑپ۔ پہلے جاگیردار کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کیا تھا‘ اب سرمایہ دار کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے‘ لیکن توازن اب بھی برقرار نہیں رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست ایک بہت بڑی جاگیردار اور سرمایہ دار بن گئی۔ انسان پھر اُسی بندھن میں بندھے رہ گئے۔ اب مطلق العنانیت (totalitarian system) ہے۔ کام کرو اور روٹی کھاؤ۔ آزادیٔ رائے اور اظہارِ آزادیٔ رائے کس چڑیا کا نام ہے‘ اسے بھول جاؤ۔ کیسے کیسے پنچھی‘ کس کس مصیبت سے وہاں سے اُڑ کر پہنچتے ہیں کہیں آزاد دنیا میں‘ آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ؎

یہ داغ داغ اُجالا‘ یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں!

وہ آزادی انسان کے ہاتھ میں نہیں آ رہی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان اپنی سوچ‘ اپنے غور و فکر اور عمل کے ردِّعمل کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ربّ کے حضور درخواستِ ہدایت کی تکرار

یہ ہے وہ پس منظر جس میں گھٹنے ٹیک کر دعا کرنے کا مقام ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے مطابق ع ’’طالب ہو خدا سے کہ خدا ہی کا ہے یہ کام‘‘ یہاں تو اُسی سے مانگنا پڑے گا:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾

’’(اے ربّ!) تُو ہی ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت عطا فرما۔‘‘

ہدایت کے بارے میں مباحث عام تفاسیر میں مل جائیں گے‘ کہ ہدایت کے مختلف مدارج ہیں۔ راستہ سجھا دینا اور سمجھا دینا بھی ہدایت ہے اور انگلی پکڑ کر چلانا اور منزل تک پہنچا دینا بھی ہدایت ہے۔ اس ہدایت کی انسان کو ہر لحظہ ضرورت ہے۔ سیدھے راستے پر تو آ گئے‘ لیکن یہ معاملہ کوئی ایسا تو نہیں ہے کہ آگے کوئی دوراہا نہیں آنا۔ قدم قدم پر دوراہے‘ سہ راہے اور چوراہے ہیں۔ ہر آن اندیشہ ہے کہ یہاں سے تو بچ کر آ گیا ہوں آئندہ کہیں غلط نہ مڑ جاؤں‘ لہٰذا ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾۔ آپ روزانہ پانچ وقت کئی مرتبہ دُہراتے کہ پروردگار! تیرا ہی دامن تھامیں گے تو ان پُرپیچ راہوں سے سلامتی کے ساتھ گزر سکیں گے۔ ہم کسی غلط موڑ پر نہ مڑ جائیں اور سیدھے اپنی منزلِ مراد پر جا پہنچیں‘ لہٰذا ہمیں صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی عطا فرما۔ صراطِ مستقیم مرکبِ توصیفی ہے‘ بالکل سیدھا راستہ۔

اگلی دو آیات میں اس سیدھے راستے کی مزید وضاحت ہے۔ اس سے مزید رہنمائی مل رہی ہے کہ یہ کتنی بڑی دولت اور کتنی بڑی نعمت ہے۔ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا پھر وہ زیادہ تفصیل سے ذکر کرتا ہے‘ جیسے سورۂ طٰہٰ میں ہم نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے جو شرفِ مکالمہ اور مخاطبہ حاصل ہوا تھا اس میں بات کو طول دے رہے ہیں۔ سوال صرف یہ تھا: ﴿وَمَا تِلۡكَ بِيَمِيۡنِكَ يٰمُوۡسٰى ۝١٧﴾ ’’اے موسیٰ! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟‘‘ لیکن جواب ملاحظہ ہو:

﴿قَالَ هِىَ عَصَاىَ‌ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيۡهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىۡ وَلِىَ فِيۡهَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰى ۝١٨﴾ (طٰہٰ)

’’کہا: یہ میرا عصا ہے‘ مَیں اس پر ٹیک بھی لگا لیتا ہوں‘ اس سے اپنی بکریوں کے لیے (درختوں سے) پتے بھی جھاڑ لیتا ہوں‘ اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی کام ہیں۔‘‘

سورۃ الفاتحہ میں ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾ کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے خود فرمادی۔ اس کی مثبت اور نفی دو اعتبارات سے توضیح ہو رہی ہے۔ اس میں ہمارے لیے رہنمائی بھی ہے کہ جو کچھ مانگ رہے ہو اُس کو اچھی طرح سمجھ لو کہ کیا مانگ رہے ہو!

﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ﴾

''راستہ اُن لوگوں کا جن پر تیرا انعام ہوا۔''

﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ﴾

''جو نہ تو مغضوب علیہم ہیں (کہ اُن پر تیرا غضب نازل ہوا ہو)۔''

﴿وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾

''اور نہ گم کردہ راہ ہیں۔''

یہ مثبت اور منفی انداز میں صراطِ مستقیم کی مزید وضاحت ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک ہی جملہ ہے۔ پرنسپل کلاز ہے ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾ اور آخری دونوں آیات گویا subordinate clauses ہیں۔ یہ ﴿الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ﴾ کا بدل ہیں۔ ﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ بدلِ اوّل ہے' جبکہ ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾ بدلِ ثانی ہے۔

بنی نوعِ انسان کے تین گروہ

یہاں ہمارے سمجھنے کے لیے تین قسم کے اشخاص ہیں جن کا سورۃ الفاتحہ میں ذکر آ گیا: (۱) مُنۡعَمۡ عَلَيۡهِمۡ (۲) مَغۡضُوۡب عَلَيۡهِمۡ (۳) ضَآلِّيۡنَ۔ ایک گروہ کے راستے کو ہم نے چاہا ہے کہ ہم پر کھول دیا جائے' ہمیں اس کی ہدایت دی جائے' جب کہ دوسرے دو سے ہم نے اللہ کی پناہ طلب کی ہے کہ ان کے راستے کی طرف کہیں ہمارا رخ نہ موڑ دیجیے گا۔

مُنۡعَمۡ عَلَيۡهِمۡ کون ہیں؟ اَلۡقُرۡاٰنُ يُفَسِّرُ بَعۡضُهٗ بَعۡضًا یعنی ''قرآن کا ایک حصّہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے'' کے مصداق سورۃ النساء میں بات واضح ہوگئی:

﴿وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ

النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا ۝۶۹﴾

''جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت پر کاربند ہو جاتے ہیں انہیں معیت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیاء' صِدّیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے۔''

ذہن انسانی میں خیالات کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ جب بھی زبان سے یہ الفاظ نکلیں ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ﴾ تو بجلی کے کوندنے کے سے انداز میں ذہن میں یہ چار الفاظ آ جانے چاہئیں: ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ۚ﴾۔ یہ ہیں مُنۡعَمۡ عَلَيۡهِمۡ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ ان میں پھر درجات ہیں۔ بلند ترین درجہ نبوت کا ہے' اس سے متصل مقام صدیقیت کا ہے' پھر مرتبہ شہادت کا ہے' اور اس میں base line سمجھ لیجیے صالحین ہوتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ وَارۡزُقۡنَا مَعِيَّتَهُمۡ!

مَغۡضُوۡب عَلَيۡهِمۡ سے مراد کون ہیں؟

مُنۡعَمۡ عَلَيۡهِمۡ کو سمجھانے کے لیے تو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں' البتہ منفی انداز میں جو اسلوب آیا یہ ضرور وضاحت طلب ہے:

﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾

مَغۡضُوۡب عَلَيۡهِمۡ وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کو پانے کے بعد اپنی شرارتِ نفس اور خباثتِ نفس کی بنا پر اس ہدایت سے منہ موڑا' کج روی اختیار کی اور اس کی سزا میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے معیّن کیا ہے کہ یہاں مَغۡضُوۡب عَلَيۡهِمۡ سے مراد یہود ہیں جنہیں اوّلین شریعت ملی۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ سے پہلے کوئی شریعت نازل نہیں ہوئی۔ حضرت نوح' حضرت صالح' حضرت ہود اور حضرت ابراہیم ؑ کا ذکر قرآن میں پڑھیے۔ حضرت موسیٰ ؑ سے پہلے کے رسول یہی ہیں' جو اولوالعزم پیغمبر ہیں۔ ان کے حالات میں شریعت کا ذکر نہیں ملے گا۔ ساری بات توحید اور شرک پر ہوتی تھی۔ ابھی تمدنِ انسانی اتنا پیچیدہ نہیں ہوا

تھا۔ تمدن کی جو اُلجھنیں میں نے گنوائی ہیں یہ تو ان میں ارتقا ہوا ہے۔ سب سے ابتدائی اُلجھن جو پیدا ہوگئی تھی وہ مرد اور عورت کے درمیان توازن کی ہے۔ ابھی نظامِ اجتماعی تھا ہی کہاں کہ فرد اور اجتماعیت کے درمیان توازن کا مسئلہ پیدا ہوا ہوتا۔ اسی طریقے سے معاش انتہائی سادہ درجے میں تھا۔

ایچ جی ویلز کا تاریخ کا مقالہ میں نے پڑھا' بہت عمدہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رومن ایمپائر میں پہلی مرتبہ کرنسی کا رواج ہوا' اس سے پہلے کرنسی نہیں تھی' اور معاشیات کی ساری پیچیدگیاں اس کرنسی کی ایجاد کے ساتھ آئیں۔ اس سے پہلے یہ پیچیدگیاں نہیں تھیں۔ ایک شخص کرگے پر بیٹھا ہوا کپڑا بُن رہا ہے' دوسرے نے کھیت میں گندم بوئی ہے۔ یہ بارٹر سسٹم کے تحت ایکسچینج کر لیتے تھے۔ جو کپڑا بُن رہا ہے' اسے بھی آخر اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرنا ہے' وہ اس کپڑے سے کچھ چنے یا گندم لے لے گا' اور جس نے جا کر کھیت میں کام کیا ہے اسے بھی اپنا تن ڈھانپنا ہے تو وہ اس سے کپڑا لے لے گا۔ جمع کرنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ اپنے پاس کتنا اناج رکھ لیں گے اور کب تک رکھیں گے! کپڑا بننے والا کتنا بُن بُن کے رکھتا چلا جائے گا! ہاں جب معاملہ یہ ہوگیا کہ ایک تولہ سونے کی ڈلی مساوی ہے اتنے سو من گندم کے اور اس میں اتنے تھان کپڑے کے آسکتے ہیں تو جس نے سونا سنبھال کے رکھ لیا اُس کے ہاتھ میں ایک purchasing power مرتکز ہوگئی۔ ایچ جی ویلز کے الفاظ یہ ہیں کہ انسان کو کچھ شعور نہیں تھا کہ کرنسی ایجاد کر کے اس نے کتنی بڑی لعنت کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ لہٰذا جو یہ سارا تدریجی ارتقا ہو رہا تھا اس میں شریعت کی ضرورت پیش آئی' جس میں تفصیلی احکام دیے جائیں کہ یہ کرو' یہ مت کرو!

اس کا اصلاً ذکر ہمیں ملتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں۔ پہلی کتاب جو اُتری ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام پر کسی کتاب کے اترنے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ صُحفِ ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن وہ اب دنیا میں کہیں نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کے ساتھ ''ملّتِ ابراہیمی'' کا لفظ ملے گا۔ ملّتِ ابراہیمی کی پانچ چیزیں حضور ﷺ نے گنوائی ہیں: ختنہ کرنا' زیرِ ناف بال اُتار دینا' ناخن کاٹنا' مونچھیں کاٹنا'

بغلوں کے بال اُتارنا وغیرہ[۳۶]۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں ''مِنَ الْفِطْرَةِ'' (فطرت کا حصّہ) قرار دیا گیا اور یہی درحقیقت وہ بنیادی تعلیمات ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ باقی احکامِ شریعت یعنی حلال اور حرام' جائز اور ناجائز' اوامر و نواہی' واجب' مستحب' فرض' مکروہ تحریمی' حرامِ مطلق کی تفصیل موجود نہیں تھی۔ جب تمدن میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تب یہ سارے مسائل پیدا ہوئے۔ لہٰذا جو پہلی شریعت ہے' وہ شریعتِ موسوی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے اپنی خباثتِ نفس اور شرارتِ نفس کی وجہ سے اس شریعت میں تحریف کی۔ اس کو اپنی خواہشات کا تختۂ مشق بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی قوم مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی نمایاں مثال بن گئی۔ یہ علامت (symbol) ہے مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ﴾ (البقرۃ:۶۱)

''ان پر ذلت و خواری اور محتاجی و کم ہمتی تھوپ دی گئی' اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔''

چنانچہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ٹھہرے۔ انہوں نے ہدایتِ خداوندی کے آنے کے بعد گمراہی کا راستہ اختیار کیا۔ جیسے سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا ۢ بَيْنَهُمْ ۗ﴾ (آیت ۱۴)

''اور انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا آپس میں ضدم ضِدّا کے باعث۔''

انہوں نے تفرقے کی راہ جو نکالی ہے وہ کسی مغالطے یا اندھیرے کی وجہ سے نہیں' بلکہ علم کے آ جانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کے لیے' اپنی انانیت' اپنی ذات پرستی کے باعث نکالی ہے۔ تو یہ ہیں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔

ضَآلِّيْنَ سے مراد کون ہیں؟

اس لفظ کو اس کی اصل حقیقت کے اعتبار سے سمجھنا بہت ضروری ہے' اس لیے کہ یہ

لفظ سورۃ الضحیٰ میں حضور ﷺ کے لیے بھی آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ ''اُس نے آپؐ کو متلاشیٔ حق پایا تو سیدھی راہ سجھائی۔'' اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ یا تو ابھی کوئی ہدایت کا طالب ہے' ابھی تک اسے ہدایت ملی نہیں' کوشاں ہے' متلاشی ہے' اس کے حصول کے لیے محنت کر رہا ہے۔ یا یہ کہ کسی وقت نیکی کے جذبے میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر کے صحیح راستے سے ہٹ گیا ہے۔ لفظ ''ضَآلّ'' کے یہ دو مفہوم ہیں۔

ایک تیسرا مفہوم بعض حضرات صرف نکتہ آفرینی کے طور پر پیدا کرتے ہیں' اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کی محبت میں اس کیفیت کو پہنچ جائے کہ اس پر محبت کا غلبہ ہو جائے' محبت میں مغلوب الحال ہو جائے تو اس پر بھی ''ضَآلّ'' کے لفظ کا اطلاق ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ساری کوشش اس لیے کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے لیے جب یہ لفظ آ گیا تو اس کی ایسی تاویل ہونی چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ پر عشقِ خداوندی کا غلبہ ہو گیا تھا' آپ ﷺ محبتِ الٰہی سے مغلوب الحال تھے۔ لیکن یہ صرف نکتہ آفرینی ہی ہے۔

درحقیقت اس کے دو ہی مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شخص جس پر ابھی ہدایت منکشف نہیں ہوئی (اس میں ہدایت کی طلب شدید ہے) اور وہ غور و فکر کر رہا ہے' سوچ بچار کر رہا ہے۔ غور و فکر اور عبرت پزیری کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس کے لیے شرح حدیث میں ''التفکّر و الاعتبار'' کا لفظ آیا ہے۔ طالبِ ہدایت ہے لیکن ہدایت ابھی منکشف نہیں ہوئی۔ دوسرے وہ جس کو ہدایت ملی تو تھی لیکن اُس نے اس کے اندر ایک غلط رخ اختیار کر لیا ہے' البتہ خباثتِ نفس کی وجہ سے نہیں بلکہ نیکی کا جذبہ کچھ غیر متوازن ہو گیا ہے۔ یہ بھی ''ضَآلّ'' میں شمار ہوتا ہے۔

پہلے تو اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے سمجھ لیجیے۔ اس لیے کہ حِبرالاُمّۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں ''ضَآلِّین'' سے مراد متبعین حضرت مسیح علیہ السلام کو قرار دیا ہے(۳۷)۔ مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ سے مراد یہود اور ضَآلِّین سے مراد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیرو ہیں جنھوں نے رہبانیت کی بدعت ایجاد کی۔ انہوں نے یہ بدعت کسی خباثتِ نفس کی

وجہ سے ایجاد نہیں کی۔ یہ حُبِّ دُنیا اور حُبِّ مال کے اندر حدِ اعتدال سے بڑھ جانے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ترکِ دنیا کی غرض محبتِ الٰہی ہے جس کی وجہ سے وہ گھربار چھوڑ رہے ہیں۔ شادی بیاہ نہیں کر رہے ہیں' نکاح کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تپسیائیں (سخت ریاضت' مشقت والی عبادت) کر رہے ہیں۔ پہاڑوں کی کھوہ اور غاروں میں پہنچے ہوئے ہیں۔ سانپوں اور بچھوؤں کے مسکنوں میں جا کر ڈیرہ لگا لیا ہے۔ کوئی پہاڑ کی چوٹی پر ریاضت کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ جذبۂ نیکی کا عدم توازن ہے' جذبۂ نیکی کا حدِ اعتدال سے تجاوز ہے۔

اس بنا پر اگر کوئی صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے تو وہ ''مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ'' میں شمار نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ''مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ'' میں شمار ہونے کے لیے اس صحیح راستے سے اپنی خباثتِ نفس کی وجہ سے' دنیا کی محبت کی وجہ سے' نفسانی خواہشات کی پیروی کی وجہ سے' راہِ ہدایت واضح ہو جانے کے باوجود ہٹنا ہے۔ اُس کی بنیاد ہے شرارتِ نفس' جبکہ یہاں درحقیقت نیکی کا ایک جذبہ ہے جو حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ لہٰذا ہے تو گمراہی' لیکن اِس گمراہی اور اُس گمراہی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ''مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد۔'' بظاہر تو گمراہی کے لفظ کا اطلاق دونوں پر ہوگا' یہود بھی گمراہ' نصاریٰ بھی گمراہ' لیکن دونوں کی گمراہی میں بہت فرق ہے۔ یہ بات سورۃ الحدید میں بڑی وضاحت کے ساتھ آئی ہے: ﴿وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ﴾ ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی' ہم نے اسے اُن پر لازم نہیں کیا تھا' مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں۔'' ہم تو فاطر فطرتِ انسانی ہیں' ہم نے انسانی فطرت بنائی ہے اور اس کے تقاضوں کو خوب جانتے ہیں۔ ہم نے کوئی غیر فطری قدغن انسان کے فطری تقاضوں پر عائد نہیں کی' لیکن انسان نے خود عائد کر لی۔ یہ بدعت ہے جو اس قوم نے ایجاد کی۔ ہم نے تو اُن پر ایک چیز فرض کی تھی کہ اللہ کی رضا حاصل کرو' وہ رضا حاصل کرنے میں غیر معتدل ہو گئے۔ پھر یہ کہ وہ اپنی خود عائد کردہ پابندی کو نبھا بھی نہیں سکے۔ ﴿فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ (الحدید:۲۷) ''پھر وہ اس کی پابندی نہ

کر سکے جیسے کہ کرنی چاہیے تھی۔'' فطرت سے کشتی لڑیں گے تو وہ آپ کو چاروں شانے چت کر دے گی۔ کچھ لوگ مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ان کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اپنی فطرت سے لڑ جاتے ہیں اور پوری زندگی لڑتے ہوئے بسر کر دیتے ہیں۔ تاہم اکثریت کا معاملہ یہی ہو گا کہ طے تو کر لیں گے کہ شادی نہیں کریں گے' ساری عمر مجرد رہیں گے' لیکن فطرتِ انسانی سے کب تک آدمی دھینگا مشتی کرے گا؟ اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ کہنے کو راہب خانہ ہے اور اس کے تہ خانوں میں حرامی بچوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ راہبائیں اور راہب تو بن گئے لیکن چونکہ یہ فطرتِ انسانی کے خلاف معاملہ تھا' تو فطرت نے ان کو پچھاڑ دیا۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

یہ تو ''ضَالِّین'' کا ایک مفہوم ہے' لیکن یہی لفظِ ''ضَالّ'' نبی اکرم ﷺ کے لیے بھی آیا ہے تو وہاں کس معنی میں آیا ہے؟ حضور ﷺ کے لیے اس کا مفہوم ہو گا: ''تلاشِ حقیقت میں سرگرداں۔'' اندر ہدایت کی شدید طلب ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی حدیث ہے کہ جب آپ ﷺ کی عمر چالیس برس پوری ہوئی:

ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءَ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ.... (۳۸)

''پھر حضور ﷺ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی اور آپؐ غارِ حرا میں جا کر تنہائی میں عبادت کرتے تھے....''

سوال پیدا ہوا کہ کیا عبادت کرتے تھے؟ ابھی تک جبریل علیہ السلام سے ملاقات نہیں ہوئی' ابھی نماز عطا نہیں ہوئی' قرآن کا نزول شروع نہیں ہوا۔ پھر عبادت کس طرح کرتے تھے؟ اس پر شارحین حدیث کا تقریباً اجماع ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت تھی: كان صفة تعبده فی غار حراء التفكّر و الاعتبار! یعنی غارِ حرا میں حضور ﷺ کی عبادت غور وفکر' سوچ بچار' عبرت پزیری پر مشتمل تھی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ ظلم و تعدی کیوں ہے؟ کچھ لوگ ٹکڑوں کے محتاج ہیں اور کچھ لوگوں کے پاس حد درجہ افراط ہے تو ایسا کیوں ہے؟ یہ غلام ہمارے ہی جیسے انسان ہیں' ان پر کیوں یہ قیامت بیت رہی ہے؟

انسان اپنے اخلاق کے لبادے کو خود ہی کیوں تار تار کر رہا ہے؟ عصمت و عفت کیوں سر بازار نیلام ہوتی ہے؟ پھر یہ تفکّر اور غور و فکر کہ یہ کائنات کیا ہے! اس میں انسان کا کیا مقام ہے؟ اس کا مقصدِ حیات کیا ہے؟

یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے' شاید آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جائے۔ مَیں بھی مانتا ہوں کہ نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے۔ محمد مصطفیٰ ﷺ تو اس وقت بھی خاتم النّبیّین تھے جبکہ ابھی جسدِ آدم کی تیاری ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ''مَتٰى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟'' آپؐ کو نبوت کب عطا ہوئی؟ فرمایا: ((وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ))(۳۹) ''جب کہ آدمؑ ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے۔'' لیکن وہ ہے عالَمِ ارواح کا معاملہ۔ پھر اس عالَمِ جسدی میں وہ روح شامل ہو کر آئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ عالَمِ ارواح میں وہ ابھی بند کلی ہے' اس کلی کو ابھی کھلنا ہے' اس کی exfoliation ابھی ہونی ہے۔ بیج میں ایک مکمل درخت ہوتا ہے' لیکن وہ بِالقُوّہ (potentially) ہے' اور بالفعل (actually) اس درخت کو وجود میں آنے میں وقت لگتا ہے۔ یہی معاملہ ہے کہ آپ ﷺ اگرچہ پیدائشی خاتم النّبیین ہیں لیکن اس جسد کے ساتھ جب محمدٌ رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو وہ سارے مراحل آپ ﷺ نے طے کیے ہیں۔ بچپن بھی آیا ہے' لڑکپن بھی آیا ہے' نوجوانی بھی آئی ہے' جوانی بھی آئی ہے۔ تدریجاً وہ exfoliation ہو رہی ہے۔ اب وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ کلی کھلے گی اور پورے طور پر پھول بنے گی ؎

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اِک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

لیکن ابھی اس کا وقت آنا تھا۔ درحقیقت اسی کا تقاضا فطرتِ محمدی ﷺ میں پیدا ہو رہا تھا کہ گھر بار سے' ملنے جلنے سے' میل ملاپ سے طبیعت میں کچھ اکتاہٹ سی ہو رہی ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے اپنے شعر میں نقشہ کھینچا ہے: ؎

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یاربّ!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو!

اب سوچ بچار کا مادہ غالب ہو چکا ہے‘ اس لیے کہ وہ کلی اب کھلنے کو تیار ہے۔ وہ فطرت اندر سے اپناز ور لگا رہی ہے۔ وہ محمد عربی ﷺ کو غار میں کھینچ کر لے گئی ہے اور وہاں اس پھول کو کھلنا ہے‘ لیکن اس کی ابتدائی سٹیج کو سورۃ الضحیٰ میں بیان کیا گیا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ ’’اور آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی۔‘‘ آپ ﷺ باب العلم پر دستک دے رہے تھے‘ حقیقت کے قریب تر پہنچ چکے تھے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے‘ منزل نہیں ہے!

محمد عربی ﷺ عقل کی منزلیں طے کر رہے تھے اور ظہورِ نبوت کا وقت آ گیا تھا۔ علامہ اقبال ہی نے اس سارے عقدے کو خوب کھولا ہے کہ ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

خرد کی گتھیاں سلجھانے کا ایک مرحلہ ہے جس کے بعد یہ منزل آنی ہے: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝﴾ ہم نے پایا آپ کو‘ ہم نے دیکھا آپؐ کو کہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہیں تو ہدایت کے پردے اٹھا دیے۔ وحی کا آغاز ہو گیا۔ یہاں اس معنی میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے لفظ ’’ضَآلّ‘‘ آیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اس آیت (الضحیٰ:۷) کو بالکل واضح کر دیا گیا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲﴾

’’(اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ایک روح اپنے امر میں سے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے لیکن اس قرآن کو ہم نے ایسا نور بنا دیا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے

ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور یقیناً آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔‘‘

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ کی دعا کے جواب میں اب وہ بابِ ہدایت وا ہوا ہے بصورتِ نبوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پوری نوعِ انسانی کے لیے: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲﴾

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ۝۝

حواشی

(۳۳) سنن الترمذی:۳۳۷۱ قال ابوعیسٰی: ھذا حدیث غریب من ھذا الوجه.........

(۳۴) صحیح الجامع الصغیر للالبانی بحوالہ مسند احمد و سنن اربعة۔ امام البانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ملاحظہ ہو حدیث ۳۴۰۷۔

(۳۵) یہ زبان زدِ عام جملہ صوفیاء کے اقوال میں سے ہے جو حدیث کے طور پر بیان کر دیا جاتا ہے۔ بہت ساری احادیث سامنے رکھیں تو ان سے یہ معنیٰ کشید کیا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

(۳۶) صحیح البخاری:۲۶۹۷ و صحیح مسلم:۲۵۷-

(۳۷) الدر المنثور ۱/۴۱۔۴۲ و مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۲۴ میں متعدد صحابہ کے حوالے سے آپ ﷺ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ’’مغضوب علیھم‘‘ سے مراد یہود اور ’’الضالین‘‘ سے مراد عیسائی ہیں۔

(۳۸) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الوحی‘ ح۳ و صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بدء الوحی الی رسول اللّٰہ ﷺ‘ ح ۱۶۰۔

(۳۹) سنن الترمذی:۳۶۰۹ واللفظ لہ۔ و مسند احمد:۲۰۵۹۶۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ((إِنِّي عِنْدَ اللّٰهِ مَكْتُوبٌ: خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ)) ’’میں تو اس وقت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتم النبیین لکھا ہوا ہوں جبکہ آدمؑ ابھی مٹی کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔‘‘ (شرح السنة:۳۶۲۲ و مسند احمد:۱۷۲۸۰‘ وابنِ حبان:۲۰۶۳۔ ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ سنن الترمذی: ۳۸۷۰) امام الالبانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ مشکاۃ المصابیح:۵۷۵۹۔

قرآنی سورتوں کے مابین نسبتِ زوجیت

سورۃ الحاقہ کے درس کی تمہیدی گفتگو

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سورۃ الحاقہ کی لفظی اور اسلوبی مناسبت دو سورتوں سے ہے۔ ایک تو سورۃ القارعہ کے ساتھ‘ جو آخری پارے میں ہے۔ جس طرح یہاں آغاز ہوا ہے: ﴿اَلۡحَآقَّةُ ۝١ مَا الۡحَآقَّةُ ۝٢ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحَآقَّةُ ۝٣﴾ بعینہٖ سورۃ القارعہ بھی اسی انداز میں شروع ہوتی ہے: ﴿اَلۡقَارِعَةُ ۝١ مَا الۡقَارِعَةُ ۝٢ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝٣﴾۔ ایک اور مناسبت یہ ہے کہ سورۃ القارعہ میں بھی ایک جگہ پر ’’ھا‘‘ صرف اضافی طور پر قافیہ کی ضرورت کے لیے یا سکتے کے لیے آئی ہے: ﴿وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ۝١٠﴾ ’’تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟‘‘ یہ دراصل ’هِيَ‘ ہے لیکن اس کو ’هِيَهۡ‘ پڑھا اور لکھا جاتا ہے‘ اس لیے کہ اس سے وہ صوتی آہنگ قائم ہوتا ہے جو قافیہ کی ضرورت ہے۔ یہ وصف اس سورۂ مبارکہ میں بہت نمایاں ہے۔ اس میں جو اکثر آیات ’’ھا‘‘ پر ختم ہو رہی ہیں‘ ان میں ’’ھا‘‘ لفظ کا اصل حصہ نہیں بلکہ اسی ردھم اور صوتی آہنگ کے لیے‘ ایک وقفے کے لیے‘ سکتے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ اضافی حرف ہے۔

سورۃ الحاقہ کی معنوی مناسبت سورۃ الواقعہ کے ساتھ سب سے زیادہ ہے۔ ایک تو وہ بھی شروع ہوتی ہے: ﴿اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۝١ لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢﴾ سے اور اس سورۂ مبارکہ میں بھی وہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَيَوۡمَئِذٍ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۝١٥﴾ گویا کہ آغاز کے اعتبار سے بھی مناسبت ہے۔ البتہ آخری آیات کے اعتبار سے یہ دو ہی سورتیں (سورۃ الواقعہ اور سورۃ الحاقہ) ہیں جن کا اختتام ہوا ہے: ﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ

الۡعَظِيۡمِ ۝﴾ پر۔ چنانچہ ابتدا کے اعتبار سے بھی اور اختتام کے اعتبار سے بھی دونوں سورتوں میں لفظی مناسبت ہے۔

اس کے علاوہ سورۃ الواقعہ کے آخری یعنی تیسرے رکوع اور سورۃ الحاقہ کے آخری یعنی دوسرے رکوع میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ قرآن مجید کی عظمت کا بیان اور یہ آیت ﴿تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝﴾ دونوں سورتوں میں ہے۔ پھر آخری سے پہلی آیت سورۃ الحاقہ میں ﴿وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الۡيَقِيۡنِ ۝٥١﴾ اور سورۃ الواقعہ میں ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ۝٩٥﴾ آئی ہے۔ ان تمام آیات کے معانی میں بہت مشابہت ہے۔ لہٰذا سورۃ الحاقہ کی لفظی اور اسلوبی مناسبت ایک تو سورۃ القارعہ کے ساتھ ہے اور دوسرے سورۃ الواقعہ کے ساتھ۔

اب ایک خاص مضمون قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا معاملہ ہے۔ اس کی طرف مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی تفسیر قرآن کے ضمن میں توجّہ دلائی۔ قرآن مجید کا داخلی نظم خاص طور پر ان کے غور وفکر کا موضوع بنا ہے۔ اس کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے جو قدم آگے بڑھایا‘ اس میں سورتوں کے گروپوں کی تعیین بھی ہے اور مزید یہ حقیقت کہ قرآن حکیم کی اکثر و بیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ اس نسبتِ زوجیت سے مراد یہ ہے کہ دو سورتیں مل کر کسی مضمون کی تکمیل کر رہی ہیں۔ ایک مضمون ایک سورۃ میں ہے‘ دوسرا مضمون دوسری سورۃ میں‘ اور دونوں مل کر کسی ایک مضمون کو بیان کر رہی ہیں۔ یہ نسبتِ زوجیت ہے۔ انگریزی میں اسے complementary اور supplementary کہتے ہیں۔ گویا دو چیزیں آپس میں ایک دوسرے کو complement کر رہی ہوں یا supplement کر رہی ہوں۔ مضامین کا اس طرح کا تعلق قرآن مجید کی اکثر و بیشتر سورتوں میں ہے اور وہ جوڑوں کی شکل میں ہیں۔

تخلیق کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون یہ معلوم ہوتا ہے: ﴿وَمِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ﴾ (الذاریات:۴۹) یعنی ہم نے جو شے بھی پیدا کی ہے وہ جوڑوں کی شکل میں ہے۔ حیوانات اور نباتات میں جوڑوں کا ہونا بالکل نمایاں ہے۔ اسی طرح اور

بھی چیزوں میں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں یہ کوئی خاص وصف ہے۔ اسی کے حوالے سے ایک بڑی لطیف سی بات ہے کہ یہ دنیا کی زندگی بھی نامکمل ہے جب تک اس کے ساتھ اس کا جوڑا شامل نہ ہو‘ یعنی آخرت کی زندگی۔ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کے مابین نسبتِ زوجیت کے حامل ہیں۔ یہی وہ فلسفہ ہے کہ انسان کی اخلاقی حِس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں ہے جب تک کہ آخرت کو نہ مانا جائے۔ جیسے مرد نامکمل ہے عورت کے بغیر‘ عورت نامکمل ہے مرد کے بغیر‘ دونوں درحقیقت ایک مقصد کی تکمیل کرنے والے ہیں‘ ایسے ہی یہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کے بغیر نامکمل رہیں گے۔ یہ دونوں مل کر ایک حقیقت کی تکمیل کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں بھی یہ نسبتِ زوجیت اکثر سورتوں میں موجود ہے۔ کہیں تو بہت نمایاں ہے‘ جیسے مدنی سورتوں کے جوڑے سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم دونوں کا آغاز ”یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ“ سے ہو رہا ہے۔ ان دونوں کا موضوع مسلمانوں کی معاشرتی زندگی‘ عائلی زندگی‘ گھریلو زندگی‘ شوہر اور بیوی کے مابین تعلق ہے۔ اس کی ایک انتہا یہ ہے کہ عدم موافقت ہو جائے تو طلاق تک نوبت آ جائے‘ جو سورۃ طلاق کا مضمون ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ باہمی محبت اتنی ہو جائے کہ ایک دوسرے کی دل جوئی کی وجہ سے دین کے احکام میں خلل آنے لگے۔ یہ سورۃ التحریم کا مضمون ہے۔ معلوم ہوا کہ دونوں سورتوں نے مل کر ایک موضوع کی تکمیل کر دی۔

اسی طرح ۲۹ ویں پارے کے آغاز میں جو چھ سورتیں آئی ہیں‘ ان کے بعد ساتویں اور آٹھویں سورتیں ہیں: سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر۔ ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ ......یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ....﴾ مزمل اور مدثر دونوں کے بالکل ایک ہی معنی ہیں: ”اے کمبل میں لپٹنے والے‘ اے اپنے کپڑے میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ‘ کمربستہ ہو جاؤ!“ ایک کھڑا ہونا ہے رات کا: ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ②﴾ وہ ہے ذاتی تربیت‘ ذاتی مشقت اور ریاضت جو ابتدائی دور میں حضور اکرم ﷺ سے کرائی گئی۔ دوسرا کھڑا ہونا‘ کمربستہ ہونا دن کا ہے‘ دعوت و تبلیغ کے لیے: ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ

فَكَبِّرْ ③﴾ معلوم ہوا کہ بہت ہی نمایاں طور پر ان دونوں سورتوں کے مابین نسبتِ زوجیت موجود ہے۔

قرآن مجید کے آغاز میں سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران کے درمیان بھی نسبتِ زوجیت بہت نمایاں ہے۔ دونوں کو حضور اکرم ﷺ نے ایک نام دیا ہے: اَلزَّهْرَاوَيْن ”دو انتہائی تابناک اور روشن سورتیں۔“ دونوں کا آغاز ”الٓمّٓ“ سے ہوتا ہے اور دونوں کے اختتام پر بڑی عظیم دعائیں ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کا اختتام جن دو سورتوں پر ہوتا ہے‘ ان کا بھی ایک ہی نام ہے: مُعَوَّذَتَیْن۔ دونوں میں تعوذ کا مضمون ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک میں سکھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے حوالے سے پناہ طلب کرو جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ کسی شخص کا حسد‘ کوئی جادو کر رہا ہے‘ ٹونا ٹوٹکا کر رہا ہے‘ رات کی تاریکی میں بلائیں‘ ان سب سے انسان اللہ کی پناہ طلب کرتا ہے۔ اگلی سورت میں تعوذ ہے خود انسان کے اپنے نفس سے جو وسوسے اٹھتے ہیں۔ اگرچہ پھونکیں مارنے والا شیطانِ لعین ہے‘ لیکن وہ انسان کے اندر سے ہو کر فساد پیدا کرنے والی شے ہے۔

مَیں نے یہاں دو دو جوڑے بتا دیے کہ ایک تو ان چھ سورتوں (سورۃ الملک‘ سورۃ القلم‘ سورۃ الحاقۃ‘ سورۃ المعارج‘ سورۃ نوح اور سورۃ الجن) سے متصلاً قبل اور پھر ان کے بعد بھی جوڑوں کا معاملہ بالکل نمایاں ہے۔ جہاں تک سورۃ الفاتحہ کا تعلق ہے‘ وہ تو گویا ایک تاج ہے پورے قرآن مجید کے لیے۔ اسے ”اُمّ الکتاب“، ”اساس الکتاب“ کہا گیا ہے۔ وہ تو ایک بالکل منفرد حیثیت کی حامل سورت ہے۔ قرآن مجید کی بقیہ سورتوں میں اکثر و بیشتر نسبتِ زوجیت نمایاں ہے۔ ایک بات کو اصلاحی صاحب نے اصولاً تسلیم کیا ہے کہ بعض سورتیں منفرد ہیں‘ بلکہ انہوں نے لفظ ”ضمیمہ“ استعمال کیا ہے۔ البتہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ شاید مناسب نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض سورتیں منفرد مزاج کی ہیں‘ ان کے ساتھ کوئی جوڑا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ ”ضمیمہ“ کا اطلاق ایک سورت کے ساتھ تو بہت صحیح ہے‘ اور وہ ہے سورۃ الحجرات۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سورۃ الفتح کا ضمیمہ ہے۔ سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں جو شان آئی ہے حضور اکرم ﷺ کی ﴿مُحَمَّدٌ

رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ﴾ اور پھر صحابہؓ کی ﴿وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ﴾ درحقیقت اسی کی شرح سورۃ الحجرات میں مل رہی ہے۔ البتہ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ کسی ضمنی حیثیت یا ضمنی اہمیت کی سورت ہے۔ سورۃ الحجرات بڑی عظیم سورت ہے۔

تاہم' یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ قرآن مجید کی تمام سورتیں جوڑوں کی شکل میں نہیں ہیں۔ بعض جگہ پر منفرد مزاج' منفرد مرتبہ و مقام کی اور منفرد حیثیت کی سورتیں ملتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں اور سب سے عظیم سورۃ الفاتحہ ہے۔ اس کا کوئی لفظی اور معنوی جوڑا بہر حال موجود نہیں ہے۔ میرے نزدیک شروع میں سورۃ الفاتحہ منفرد ہے' پھر جوڑا جوڑا چل رہے ہیں سورۃ التوبہ تک۔ سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران نمایاں ترین جوڑا ہے۔ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ معنوی اور لفظی ہر اعتبار سے جوڑے کی شرطیں پوری کر رہی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف بھی نمایاں ترین جوڑا ہے۔ پھر سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ ہے۔

یہاں تک تو یہ جوڑے چلے آ رہے ہیں' البتہ اس کے بعد جو اگلا گروپ آتا ہے' اس میں تین تین کے چھوٹے گروپ ہیں۔ ان میں دو دو کے مابین وہ مناسبت اور مشابہت موجود ہے جو ان میں نسبتِ زوجیت کو ثابت کرتی ہے جبکہ ایک ایک بالکل منفرد مزاج کی سورۃ ہے۔ سورۃ یونس اور سورۃ ہود مضامین کی مشابہت کے اعتبار سے جوڑے کی شرط پر پوری اُترنے والی ہیں' لیکن سورۃ یوسف بالکل منفرد ہے۔ اس پوری سورت میں شروع سے آخر تک ایک ہی نبی کے حالات بیان ہو رہے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ پورے قرآن مجید میں منفرد ہے کہ کہیں اور یہ انداز نظر نہیں آئے گا۔ اس میں وہ اصولی مضامین جو مکّی سورتوں کے ہیں' وہ بھی بہت کم ہیں۔ ''اَنۡبَاءُ الرُّسُل'' کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں۔ ایک نبی کے حالاتِ زندگی' ان کی شخصیت' ان کے کردار' ان کی نیکی' ان کے علم' ان کے حلم' ان کی رفعت' ان کی عصمت' ان کے کردار کی بلندی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو تین سورتیں آتی ہیں ان میں سورۃ الرعد اور سورۃ ابراہیم جوڑے کی شکل میں ہیں' جبکہ سورۃ الحجر بالکل منفرد ہے۔ وہ اس جگہ سے مناسبت رکھتی نظر نہیں آتی' اس لیے کہ وہ ابتدائی

زمانے کی سورۃ ہے جبکہ پہلی دو سورتیں آخری دور کی ہیں۔ اس کے بعد سورۃ النحل منفرد ہے جبکہ سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف کے درمیان پوری نسبتِ زوجیت موجود ہے۔ پھر سورۃ مریم' سورۃ طٰہٰ اور سورۃ الانبیاء کا گروپ ہے۔ ان میں سورۃ طٰہٰ منفرد ہے' جبکہ سورۃ مریم اور سورۃ الانبیاء کے مابین نسبتِ زوجیت ہے۔ اس کے بعد سورۃ المومنون اور سورۃ الحج کا جوڑا ہے جبکہ سورۃ النور منفرد مدنی سورۃ ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دوسری مدنی سورۃ موجود ہی نہیں ہے۔

پھر جوڑوں کی شکل میں سورۃ الفرقان اور سورۃ الشعراء' سورۃ النمل اور سورۃ القصص' سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم' سورۃ لقمان اور سورۃ السّجدہ ہیں۔ پھر سورۃ الاحزاب منفرد ہے۔ پھر تمام سورتیں جوڑوں کی شکل میں چلتی چلی جائیں گی۔ ان میں سورۃ یٰسین جسے حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کا قلب قرار دیا' اس کا بھی قرآن میں کوئی جوڑا نہیں ہے' وہ منفرد ہے۔ آگے پھر جوڑے ہیں۔ سورۃ الحجرات کو سورۃ الفتح کا ضمیمہ کہہ لیجیے' اس اعتبار سے کہ اس کے ایک مضمون کی تفصیل دی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے لیے جو رہنما اصول آ گئے اس کے حوالے سے وہ قرآن حکیم کی اہم ترین سورتوں میں سے ہے' لیکن اس ترتیب کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حیثیت ضمیمہ کی ہے۔ سورۃ الفتح کے آخری رکوع کا وہ ضمیمہ بنتی ہے۔

آگے چلیے تو مکّی سورۃ ''قٓ'' منفرد ہے' اس کا کوئی جوڑا نہیں۔ البتہ سورۃ الذّاریات اور سورۃ الطور' سورۃ النجم اور سورۃ القمر' سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پھر دس مدنی سورتیں جوڑوں کی شکل میں نمایاں ہیں۔ ان میں نمایاں ترین جوڑا سورۃ التّحریم اور سورۃ الطّلاق ہے۔ اس سے پیچھے چلیے تو سورۃ التّغابن اور سورۃ المنافقون ہیں۔ ایک میں ایمان کی حقیقت بیان ہوئی ہے جبکہ دوسری میں نفاق کی حقیقت۔ اس سے پیچھے سورۃ الجمعہ اور سورۃ الصّف ہیں' جن میں ایک حضور ﷺ کے مقصد بعثت کو بیان کر رہی ہے اور دوسری حضور ﷺ کے اساسی طریقہ کار کو۔ یہ تمام سورتیں معنوی اعتبار سے جوڑوں کی شکل میں ہیں۔

اس گروپ کے اندر سورۃ الملک بھی منفرد سورۃ ہے۔ اگر تکلّف اور تصنّع کرنا ہو تو سورۃ الملک اور سورۃ القلم کو جمع کر دیجیے۔ سورۃ الحاقہ اور سورۃ المعارج کو جمع کر دیجیے۔ سورۃ نوح اور سورۃ الجن کو جمع کر دیجیے‘ ان کو جوڑا قرار دے دیجیے‘ لیکن مضامین کے اعتبار سے یہ جوڑے نہیں بنتے۔ سورۃ الملک منفرد ہے۔ جوڑے کی نسبت بنتی ہے سورۃ الحاقہ اور سورۃ القلم میں۔ اسی طریقے سے جوڑا بنے گا سورۃ المعارج اور سورۃ نوح۔ پھر سورۃ الجن بالکل منفرد ہے۔ اس کا تو مضمون بھی وہ ہے کہ قرآن مجید میں جِنّوں کی حقیقت اور ان کے معاملات اس طریقے سے کسی ایک سورۃ میں نہیں آئے۔ اس کے بعد جوڑوں کی شکل میں نمایاں سورتیں ہیں: سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر‘ سورۃ القیامہ اور سورۃ الدہر‘ سورۃ المرسلات اور سورۃ النبا‘ سورۃ النازعات اور سورۂ عبس۔ یہ سلسلہ جوڑوں کی شکل میں آخر تک چلتا جائے گا۔ یہ ہے وہ رائے جو جوڑوں کے اعتبار سے مولانا اصلاحی صاحب نے قائم کی ہے۔ اصولاً اس سے اتفاق کے بعد کہیں کہیں اس اصول کے اطلاق اور انطباق میں جو اختلاف ہے وہ میں نے بیان کر دیا۔

ان میں بعض سورتیں جو منفرد ہیں وہ فاصلے پر جوڑوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً سورۃ النّور اور سورۃ الاحزاب اپنی جگہ پر منفرد سورتیں ہیں لیکن مضامین کے اعتبار سے دونوں میں ربط ہے۔ ایک میں گھر کے اندر کا پردہ‘ ایک میں گھر کے باہر کا پردہ۔ منافقین کی ریشہ دوانیوں کا موضوع سورۃ النور میں بھی بڑی تفصیل سے بیان ہوا اور سورۃ الاحزاب میں بھی۔ پھر دونوں سورتوں میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے بارے میں واضح ہدایات ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے مابین ایک جوڑا ہونے کی نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ اسی طریقے پر اگرچہ ’’معوّذتین‘‘ ایک جوڑا ہے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا لیکن سورۃ الناس کے مضمون اور سورۃ الفاتحہ کو جوڑیے تو ان میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ کا تعارف تین الفاظ سے ہو رہا ہے: ﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾﴾ یہ تعوذ ہے جو درحقیقت عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ ہم پناہ مانگتے ہیں اس ہستی کی جسے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں پناہ دینے پر قادر

ہے۔ وہ ’’عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ‘‘ ہے۔ وہ ہر آن ہمارے ساتھ ہے‘ وہ ہماری حفاظت کر سکتا ہے۔ عبادت کا بھی یہی تصوّر ہے کہ ہم اسی ہستی کی عبادت بھی کرتے ہیں۔

سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے تعارف میں سب سے پہلے لفظ ’’ربّ‘‘ آیا ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴾۔ آگے چل کر ملك کا لفظ آتا ہے: ﴿مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴾۔ مٰلِكِ اور مَلِكِ میں کوئی فرق نہیں ہے‘ بلکہ یہ دو قراءتیں بھی ہیں۔ پھر الٰہ ﴿اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾﴾ اور الٰہ وہ ہے جس کی عبادت کی جائے: ﴿اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾۔ معلوم یہ ہوا کہ مضامین کے اعتبار سے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الناس کا بھی ایک ربط ہے۔ چنانچہ پہلی سورۃ سورۃ الفاتحہ اور آخری سورۃ سورۃ الناس کے مابین بڑی گہری مناسبت ہے۔ اسی طریقے سے سورۃ یوسف اور سورۃ طٰہٰ بھی منفرد ہیں لیکن ایک اعتبار سے ان دونوں میں ایک نسبتِ زوجیت قائم ہوتی ہے۔ سورۃ یوسف پوری کی پوری ایک نبی حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات پر ہے‘ جبکہ سورۃ طٰہٰ کا تقریباً اکثر حصہ ایک رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات پر مبنی ہے‘ نسبت معنوی یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے اور آباد ہوئے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں وہ مصر سے جان بچا کر نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے ذریعے سے دستگیری فرمائی۔ یوں ایک معنوی ربط ان دونوں سورتوں کے مابین قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طریقے سے سورۃ یٰسین اور سورۃ ق کے مضامین کے اعتبار سے‘ ان کے ردھم‘ ان کے مضامین کی جامعیت کے حوالے سے ایک ربط قائم ہوتا ہے۔

جو باتیں آج آپ کے سامنے عرض کی گئی ہیں‘ اصلاً تو یہ فراہی مکتب فکر کا نتیجۂ فکر ہے‘ اور ’’حق بحق دار رسید‘‘ کے مصداق جب اس کا تذکرہ ہو تو انہی کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ اگرچہ شروع میں ہمارے متقدمین میں سے بھی بعض نے نظمِ قرآن کے بارے میں کچھ گفتگو کی ہے‘ لیکن یہ بڑی سرسری نوعیت کی ہے‘ اس میں وہ کہیں زیادہ گہرائی میں نہیں گئے ہیں۔ بعض حضرات کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید ہمارے متقدمین نے ان چیزوں پر غور نہیں کیا‘ یا یہ کہ ان کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچیں۔ یہ بالکل غلط

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ حدیثِ نبویؐ کے مطابق اس کے عجائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے‘ بار بار پڑھنے سے یہ کبھی پرانا نہیں ہوگا‘ اس کے علوم کبھی ختم نہیں ہوں گے اور اہلِ علم اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکیں گے۔

کسی بھی شخص کے بارے میں یہ نہ سمجھیے کہ وہ تفسیرِ قرآن کے ضمن میں آخری بات کہہ چکا ہے۔ احکامِ دین کی بنیاد زیادہ تر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے عمل پر ہے۔ اس کی اصل بنیاد سُنّتِ رسول ﷺ ہے۔ قرآن مجید میں احکام بہت ہی اختصار‘ بہت ہی اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ پورے قرآن کا بمشکل بیسواں حصہ بنے گا‘ یعنی ۳۰ پاروں میں سے وہ آیات ڈیڑھ پارے سے زیادہ نہیں ہو سکتیں جن میں شریعت کے احکام ہیں۔ چنانچہ جہاں تک احکام کا تعلق ہے‘ اس میں آپ پیچھے کی طرف چلیے۔ ع ’’دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایامِ تُو‘‘۔ اسلاف کی طرف جایئے۔ اسلاف سے اور پیچھے صحابہ کرام ؓ تک جایئے۔ مزید پیچھے جایئے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ تک۔ احکامِ شریعت کے ضمن میں ہمیں پیچھے دیکھنا ہے اور پیچھے ہی کی طرف جانا ہے‘ یہاں تک کہ ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) ’’جس پر میرا عمل ہے اور میرے صحابہ کا عمل ہے‘‘ تک پہنچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم پیچھے ہٹتے ہٹتے وہاں تک پہنچ جائیں!

البتہ جہاں تک حکمت کا‘ علم کا‘ معرفت کا‘ فلسفے کا‘ سائنسی مظاہر اور مظاہر فطرت کی توجیہہ کا تعلق ہے‘ اس میں ہمیں آگے سے آگے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے امام رازیؒ تو اس دور میں تفسیر لکھ رہے تھے جب کہ ابھی فزکس‘ کیمسٹری‘ زوآلوجی‘ باٹنی اور فلکیات وغیرہ پر معلومات بہت کم تھیں۔ اکثر و بیشتر قیاسات پر مبنی تھیں۔ قرآن مجید میں ان مضامین کے بارے میں جہاں اشارات آئے ہیں ان میں ہم امام رازی کی پیروی نہیں کریں گے بلکہ جدید سائنس نے جو بھی انبار علم کا اور معلومات کا ہمارے قدموں میں لا ڈالا ہے‘ اس سے استفادہ کریں گے۔

اسی طریقے سے قرآن مجید پر غور و فکر‘ حکمتِ قرآن‘ فلسفۂ قرآن‘ حکمتِ ایمانی‘ معرفتِ قرآن کے جو نکات ہیں ان پر بھی غور و فکر جاری رہے گا۔ ہمارے ہاں لوگ اس اعتبار سے تنگ نظر ہیں کہ اگر پچھلوں نے یہ بات کہہ دی ہے تو ان سے آگے کوئی بات نہیں

کر سکتے۔ گویا کہ یہاں پر وہ سب سے بڑی گالی دے دیتے ہیں کہ یہ تفسیر بالرائے ہے کہ آپ اپنی رائے سے قرآن مجید میں کلام کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے میں نے اس حدیث کا حوالہ دیا۔ دوسرے میں آپ کو refer کرنا چاہتا ہوں بیہقیٔ وقت کی طرف‘ جو اِس دور کے مانے گئے۔ کم سے کم علمائے دیوبند کے حلقے میں یہ شے مسلّم ہے کہ بیہقی وقت کا مقام مولانا انور شاہ کاشمیری ؒ کا ہے۔ یعنی حدیث اور فقہ میں یہ اس دور کے امام تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر بڑی خوب صورت تحریر لکھی ہے کہ تفسیر بالرائے کے ضمن میں یہ غلط خیال لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوگیا ہے۔ قرآن مجید کے علم کے اندر جو نئے نئے نکات ہیں انہیں انسان اگر علم کی بنیاد پر‘ زبان کی بنیاد پر دلیل کے ساتھ بیان کرے تو اس کان کے ہیرے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے بس وہ آخری بات ہے تو پھر تو گویا کان ختم ہوگئی‘ یا اس کے ہیرے اب آپ مزید نکالنے کی کوشش نہیں کر رہے ہے۔

اس پہلو سے نظمِ قرآن کے حوالے سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ مولانا فراہیؒ سے جو بات شروع ہوئی‘ اسے آگے بڑھایا مولانا اصلاحیؒ نے۔ قرآن مجید کی سورتوں کے گروپوں اور جوڑوں کے معاملہ سے اصولی اعتبار پر مجھے کامل اتفاق ہے۔ بعض سورتوں کے منفرد ہونے کے ضمن میں مولانا اصلاحی صاحب کا قول میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ البتہ اس اصول کے اطلاق اور انطباق میں بعض جگہ پر مجھے ان سے اختلاف ہے کہ منفرد سورتوں کو بھی انہوں نے جوڑوں میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ گویا اس میں صرف تکلّف نہیں‘ تصنّع تک کی بات آگئی اور یہ بات مجھ سے اور حضرات نے بھی کہی کہ اگر ہم اس طرح کی نسبتِ زوجیت نکالنے لگے تو یہ قرآن مجید کی ہر دو سورتوں کے مابین نکل آئے گی۔ مجھے اس بات کے اندر کچھ وزن معلوم ہوا‘ اور میں نے اس لیے تفصیل سے یہ بات کر دی ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے اس اصول کو پوری طرح ردّ کر دیا جائے۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اگر قبول کرتا ہے تو بالکلیہ کرتا ہے جبکہ کسی شے کو ردّ کرتا ہے تو وہ بھی مکمل طور پر ردّ کر دیتا ہے۔ میرے نزدیک اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ غور و فکر جاری رہنا چاہیے۔ ❁❁

پاکستان اور اسرائیل

ایوب بیگ مرزا

آج کل بعض پاکستانی اپنے دانشوری بگھارتے ہوئے بڑے پُرزور انداز میں یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ: اگر مشرقِ وسطیٰ کی عرب ریاستیں جن کا اصلاً اسرائیل سے تنازع ہے' وہ اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو پاکستان کے لیے اسرائیل کو تسلیم کر لینے میں کیا رکاوٹ ہے؟ پاکستان کا تو اسرائیل سے براہِ راست کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ راقم کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ ان نام نہاد دانشوروں کی جہالت ہے یا حماقت کہ یہ لوگ یہودیوں سے مسلمانوں کی مڈبھیڑ صرف جغرافیائی بنیادوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ کچھ بڑی طاقتوں نے سازش کے ذریعے یہودیوں کو فلسطین میں گھسا دیا۔ پھر اپنے ان ہی سرپرستوں کے ذریعے اسرائیل کو وجود میں لایا گیا۔ آغاز میں اسرائیل کے لیے پانچ ہزار مربع کلومیٹر رقبہ ہتھیایا گیا اور پانچ لاکھ یہودیوں کو وہاں آباد کیا گیا۔ آج اسرائیل کا رقبہ ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی نوے لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ لہٰذا مسلمان عرب ریاستوں کا اسرائیل سے یہ اضافی جھگڑا ہے کہ اسرائیل نے ان کے علاقوں پر قبضہ کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ عربوں کی بزدلی اور نااہلی کی وجہ سے ہوا کہ وہ سکڑتے چلے گئے اور اسرائیل پھیلتا چلا گیا۔

تاہم ''اسرائیلی ریاست نامنظور'' کی اصل اور حقیقی وجہ دینی اور روحانی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو مسلمان عرب کا ہو یا عجم کا' اسے اسرائیل کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہونا ہوگا۔ قرآن وحدیث کی رُو سے بھی یہ اُس کی دینی ذمہ داری ہے۔ پاکستان تو مملکتِ خداداد ہے جو نظریہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ لہٰذا ہمیں اسرائیل کی محض مخالفت ہی نہیں کرنی بلکہ اسے نیست ونابود کرنے کے لیے بھی پاکستان کو صفِ اوّل میں کھڑا ہونا ہوگا۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اسرائیل کو ''مغرب کا ناجائز بچہ'' قرار دیا تھا۔ قائدِ ملت لیاقت علی خان نے امریکہ میں یہودیوں کے روبرو یہ بات کہی تھی کہ Gentlemen! Our souls are not for sale۔ لیاقت علی خان کوئی مذہبی رہنما نہیں تھے لیکن ان پر بھی یہ بات واضح تھی کہ یہ بدنی (یعنی جغرافیائی) نہیں روحانی مسئلہ ہے۔ تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بھی دوٹوک انداز میں کہا تھا کہ: ''سارا عرب بھی اگر اسرائیل کو تسلیم کر لے تب بھی پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا' کیونکہ یہ ہمارے ایمان کا مسئلہ ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید' جو اگرچہ سیاسی اور معاشی لحاظ سے انتہائی کمزور ہو چکے تھے' انہیں جب صہیونیوں نے یہ پیشکش کی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں الگ ریاست بنانے کی اجازت دے دیں تو وہ سلطنتِ عثمانیہ کے تمام قرضے ادا کر دیں گے' تو خلیفہ کا جواب یہ تھا کہ وہ اس مقدس زمین کی خاک کی چٹکی بھی یہودیوں کو دینے کو تیار نہیں۔

مسلمانوں کے لیے آخری' حتمی فیصلہ اور حکم تو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ہے۔ لہٰذا ایک طرف اللہ تعالیٰ ہمیں سورۃ المائدہ کی آیت ۸۲ کے آغاز میں آگاہ کرتا ہے کہ تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ دوسری طرف سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۱۲ میں فرمایا گیا:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

''ان کے اوپر ذِلت تھوپ دی گئی ہے جہاں کہیں بھی پائے جائیں سوائے یہ کہ (انہیں کسی وقت) اللہ کا کوئی سہارا حاصل ہو جائے یا لوگوں کی طرف سے کوئی سہارا مل جائے' اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کے اوپر کم ہمتی مسلط کر دی گئی۔ یہ اس لیے ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے رہے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے رہے۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور حدود سے تجاوز کرتے رہے۔''

تو پھر ہم اس قوم کو تسلیم کیوں کریں جس پر اللہ نے ذلّت مسلّط کر دی ہے اور ہم ان میں کیوں شمار کیے جائیں جو اس مغضوب قوم کو سہارا دیے ہوئے ہیں؟ یاد رہے کہ سورۃ الفاتحہ جو ایک مسلمان نماز کی ہر رکعت میں دہراتا ہے' اسی سورت میں یہودیوں کو ''مغضوب علیھم'' قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آدم وابلیس کا قصہ سات مرتبہ دہرایا گیا ہے جس میں ابلیس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے' اپنی اس روش پر اکڑ جانے اور خود کو آدم سے برتر ثابت کرنے کی کوشش پر ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ اسی مبارک کلام یعنی قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے بڑی عنایات کیں‘ سمندر کو پھاڑ کر ایک کھلی سڑک کی شکل دے دی کہ وہ فرعون سے بچ سکیں‘ کھانے کے لیے مَنّ و سلویٰ اُتارا‘ لیکن وہ قوم نافرمانی کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انبیاء کا ناحق قتل بھی کیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت اور دوسروں کی محتاجی مسلّط کر دی گئی۔ اگر ہم قرآن حکیم کو غور سے پڑھیں تو یہ بات بڑی آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہے اور ایک مشابہت دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح انسان کے زمین پر بسنے سے پہلے ابلیس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ کیا گیا اسی طرح دنیا میں یہود ظاہری طور پر تو بڑی ترقی کرتی اور آگے بڑھتی ہوئی قوم نظر آئے گی لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے اور تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ دُنیا میں وقفوں سے ایسے حکمران آئیں گے جو انہیں ذلت و خواری اور شکست و ریخت سے دوچار کرتے رہیں گے اور یہ نیست و نابود ہوتے نظر آئیں گے۔ ایسا تاریخ انسانی میں بارہا ہوا ہے۔ گزشتہ صدی میں یہ ہٹلر کے ہاتھوں بدترین انجام کو پہنچے تھے۔ لہٰذا ایسے وہ لوگ جو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کرتے ہیں‘ وہ ہوش کے ناخن لیں اور مسلمانوں کو برے انجام کی طرف نہ دھکیلیں۔ اسرائیل کو تسلیم کرنا اُمّتِ مُسلمہ کا خودکش حملہ ہوگا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کا اسرائیل سے کیا جھگڑا ہے‘ ایسے لوگ ماضی بعید ہی سے نہیں بلکہ ماضی قریب کے حالات سے بھی نابلد ہیں۔ کیا انہیں اسرائیل کے سابق وزیراعظم بن گوریان کا پیرس میں دیا گیا وہ بیان معلوم نہیں جو اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ جیتنے پر فتح کا جشن مناتے ہوئے دیا تھا کہ ہمارا اصل دُشمن اور حریف پاکستان ہے کیونکہ وہ ایک نظریاتی اسلامی ملک ہے اور اس کے پاس مضبوط پیشہ ورانہ صلاحیت کی حامل فوج ہے‘ یہ عرب بیچارے ہمارا کیا مقابلہ کریں گے! یاد رہے کہ پاکستان اس وقت ابھی ایٹمی قوت بھی نہیں بنا تھا۔ کیا ایسے نام نہاد دانشوروں کو معلوم نہیں کہ اگر ہم اسرائیل کو تسلیم کریں گے تو گویا ہم بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ تسلیم کر لیں گے جہاں مسجد اقصیٰ ہے۔ اس مسجد میں نبی اکرم ﷺ نے تمام انبیاء کی جماعت کی امامت کی تھی اور پھر آسمانی سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ کیا ان دانشوروں کو یہ معلوم نہیں کہ یہودیوں نے اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ کندہ کیا ہوا ہے کہ ’’اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک!‘‘

کیا انہیں معلوم نہیں کہ یہودی مدینہ منورہ پر بھی اپنا حق جتاتے ہیں جسے ہم مدینۃُ الرّسول کہتے ہیں‘ جہاں آپ ﷺ کا روضۂ اَقدس ہے۔ کیا ہم معاذ اللہ‘ معاذ اللہ اس روضہ کی بے حرمتی برداشت کر سکتے ہیں کہ نبی اقدس ﷺ کے شہر کی خاک یہودیوں کے ناپاک پاؤں تلے آئے!

کیا ’’لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ‘‘ کی بنیاد پر بننے والی ریاست اس جابر‘ ظالم اور ناجائز ریاست کو تسلیم کر لے جو اس کے کلمہ گو بھائیوں کا غزہ میں دن رات قتل عام کر رہی ہے؟ کیا خوراک کے حصول کے لیے فاقہ زدہ لوگوں پر فائرنگ کرنے والوں کا انصاف سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ دنیا کے دوسرے انسانوں اور ان تمام اداروں کے لیے چاہے وہ اقوام متحدہ ہو‘ سلامتی کونسل ہو‘ بنیادی انسانی حقوق کے نام نہاد علم بردار ہوں یا دنیا میں امن و امان اور سلامتی کی دُہائیاں دینے والے ہوں‘ ان سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ یہ عملی طور پر کتنے بھی کمزور مسلمان کیوں نہ ہوں‘ دین سے ان کا جذباتی لگاؤ انتہائی شدید ہے۔ یہ نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں لیکن شعائرِ اسلام‘ مقدس مقامات‘ نبی اکرم ﷺ کی مبارک ذات‘ آپ ﷺ کے پیارے شہر مدینہ اور آپ ﷺ کے مقدس مزار کی خاطر کٹ مرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ بات غلط ہے یا صحیح لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی مسلمان مدینہ کو مکہ پر بھی ترجیح دیتا ہے اور خاص طور پر اس لیے کہ یہودی اپنی نسبت مدینہ سے جوڑتا ہے کہ انہیں وہاں سے نکالا گیا تھا۔ لہٰذا مدینہ کی طرف نگاہِ بد ڈالنے سے پہلے اسرائیل کو اپنے راستے سے پاکستان کو ہٹانا ہے۔ وہ پاکستان جس میں جذباتی مسلمان بستے ہیں اور وہ پاکستان جو ایٹمی صلاحیت کا حامل ہے۔ پاکستان سے نمٹے بغیر گریٹر اسرائیل کا قیام ممکن نہیں۔ یہ بات اگر ہم جیسوں کو معلوم ہے تو اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کو کہیں زیادہ گہرائی اور سنجیدگی سے معلوم ہو گی۔ لہٰذا نیتن یاہو کا حالیہ بیان حقیقت کے عین مطابق ہے کہ پاکستان کے ایٹمی دانت توڑنا ہوں گے‘ جبکہ ہم کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا اسرائیل سے براہ راست جھگڑا کیا ہے!

اب آیئے اس جال کی طرف جو ’’ابراہم اکارڈ II‘‘ کے نام سے بچھایا جا رہا ہے۔ اس اکارڈ کا اصل سرغنہ امریکہ ہے۔ امریکہ کے سابق صدر بل کلنٹن نے اس کا آغاز کیا اور خود درمیان میں کھڑے ہو کر مسلمانوں اور یہودیوں کا ہاتھ ایک دوسرے سے ملا کر کہا کہ تم تو ایک دوسرے کے کزن ہو‘ حالانکہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝٦٧﴾ (آل عمران)

''(تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ) ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی' بلکہ وہ تو یکسو ہو کر اللہ کے فرماں بردار تھے۔ اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے۔''

سوال یہ ہے کہ قرآن کریم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودیت اور نصرانیت سے بالاتر اور یکسو مسلم قرار دیتا ہے جبکہ ہم ابراہم اکارڈ کے نام پر اس ڈرامے کو قبول کرنے پر تیار بیٹھے ہیں؟ اس اکارڈ کا ایک رکن یعنی اسرائیل دوسرے رکن یعنی مسلمان کے خون کی ندیاں بہا رہا ہے اور پھر بھی سب اس اکارڈ کے سائے میں اکٹھے ہو جائیں؟

اکارڈ I ہو یا II' یہ سب جھانسا' فریب اور فراڈ ہے۔ بڑا سادہ سا سوال ہے کہ عرب و عجم کے مسلمان اگر ابراہم اکارڈ کا حصہ بن جائیں تو پھر کیا گریٹر اسرائیل صہیونیوں کا ہدف نہیں رہے گا؟ کیا اسرائیل اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر کندہ یہ عبارت مٹا دے گا کہ: ''اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک۔'' کیا اسرائیل ایک اچھا بچہ بن کر اپنی ان سرحدوں پر قناعت کر لے گا؟ ہرگز ہرگز ایسا ممکن نہیں۔ یہ جو مئی ۲۰۲۵ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی ہے اور اسرائیل نے ایران پر حملہ کیا ہے' اسے موجودہ صورت حال سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ درحقیقت نادیدہ قوتوں نے یہ مختصر جنگیں مستقبل میں ہونے والی بڑی جنگوں کے لیے اپنی سٹرٹیجی طے کرنے کے لیے کروائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مسلمان ممالک کو فی الحال ان نادیدہ قوتوں کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھا۔ پاک بھارت جنگ تو درحقیقت ''ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ'' تھی۔ یہ نادیدہ قوتیں پاکستان کی اصل عسکری اور جنگی قوت کا اندازہ لگا رہی تھیں' اس لیے انہوں نے اپنے حلیف بھارت کی آغاز میں کوئی مدد نہیں کی تاکہ پاکستان کی اصل قوت کا اندازہ ہو سکے اور چین کے طرزِ عمل کو بھی اس حوالے سے جانچا جا سکے۔ جب انہوں نے یہ مقاصد حاصل کر لیے تو پھر جلدی سے جنگ بندی کروا دی۔ پاکستان کے بارے میں یہ جانچنا ضروری تھا کہ وہ روایتی جنگ کے حوالے سے کتنے پانی میں ہے۔ البتہ ایران کے بارے میں اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کو بڑا سرپرائز ملا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایران کو جنگ میں نیچا دکھا کر وہاں رجیم چینج کر دی جائے اور ان حکمرانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے جو ''مرگ بر امریکہ'' اور ''مرگ بر اسرائیل''

کے نعرے لگاتے ہیں۔ پھر وہاں رضا شاہ پہلوی کے خاندان کو دوبارہ تخت نشین کیا جائے اور ایران میں ایک امریکہ دوست حکومت قائم کی جائے۔ یہاں پھر معاملہ پاکستان سے جڑتا ہے۔ جب تہران سی آئی اے اور موساد کا ٹھکانا بن جائے تو پھر پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے خلاف سازش اور تخریب کاری سے اس کی ایٹمی صلاحیت کو نقصان پہنچایا جائے۔ یاد رہے نیتن یاہو برملا کہہ چکا ہے کہ پاکستان کی ایٹمی قوت ختم کرنا ازحد لازم ہے۔ کبھی یہ کام امریکہ افغانستان میں بیٹھ کر کرنا چاہتا تھا۔ افغانستان میں انہیں ایک دن چین کا نصیب نہ ہوا۔ اب منصوبہ یہ تھا کہ ایران میں رجیم چینج کر کے پاکستان کے خلاف یہ کارروائی کی جائے۔ امریکہ پاکستان کے کسی ہمسایہ ملک میں جم کر بیٹھ کر ایسی تخریب کاری کرنا چاہتا ہے۔ یہ راقم کا محض اندازہ یا تبصرہ نہیں ہے بلکہ ہیلری کلنٹن آن ریکارڈ ہے کہ ہم نے ایک ایسی ریپڈ فورس تیار کی ہے جو پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کر لے گی۔ جب تک پاکستان ایٹمی قوت ہے' اسرائیل مشرق وسطیٰ میں اپنے اہداف کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسرائیل کے سابق وزیراعظم بن گوریان ہوں یا موجودہ وزیراعظم نیتن یاہو' دونوں بالکل درست کہتے ہیں کہ ان کا اصل دشمن پاکستان ہے۔ اگر اب بھی پاکستان کے نام نہاد دانشور یہ کہیں کہ پاکستان کا اسرائیل سے کیا لینا دینا' تو اُن کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔

مسلمان عرب ریاستوں کے حکمران جس طرح اسرائیل کے سامنے بچھے جا رہے ہیں یہ صرف اور صرف اپنا اقتدار بچانا چاہتے ہیں۔ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ گریٹر اسرائیل کا قیام یہود کا اصل ایجنڈا ہے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے صہیونی سب کچھ تہ تیغ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا کسی مسلمان عرب ریاست کی پہلے اور کسی کی بعد میں باری آ سکتی ہے۔ صہیونیوں کا عقیدہ ہے کہ انسان صرف یہودی' باقی سب محض انسان نما جانور (Goyim) ہیں لہٰذا اُن سے کسی خیر کی توقع رکھنا خود فریبی ہے۔ عربوں کو سمجھنا ہوگا کہ اسرائیل سے اچھے تعلقات بنانا اس کا تر نوالہ بننا ہے۔ لہٰذا عربوں کو اس زاویہ سے سوچنا چاہیے کہ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ لڑ کر مرا جائے۔ تاریخ میں عزت پائیں گے۔ اللہ اُن کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں۔ شاید تاریخ کا پانسا پلٹ جائے وگرنہ اللہ کے ہاں تو فلاح اور کامیابی نصیب ہوگی۔ اگر عرب ہمت کریں گے تو پاکستان کی ایٹمی قوت بھی انہیں میسر آ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا حامی و ناصر ہو۔ آمین یا ربّ العالمین!

سورۃ الکوثر: چند تشریحی پہلو

مولانا عبدالمتین ☆

تعارف

(۱) سورۃ الکوثر قرآن پاک کی سب سے چھوٹی سورت ہے۔

(۲) پہلی آیت کے لفظ ''کوثر'' کی نسبت سے اس سورت کا نام ''کوثر'' رکھا گیا ہے۔

(۳) اس سورۂ مبارکہ میں اللہ ربّ العزت نے مقامِ رسالت اور شانِ رسالت کا بیان فرمایا ہے۔ رسالت کا عقیدہ نہایت اہم اور بنیادی عقیدہ ہے اسی لیے پورے قرآن میں جگہ جگہ توحید، رسالت اور آخرت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۴) اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور مرتبہ کا ذکر ہے۔

(۵) اس سورت میں نماز اور قربانی کا بھی بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ نماز بدنی عبادات کا نچوڑ ہے اور قربانی مالی عبادات کا بہترین خلاصہ ہے۔

(۶) یہاں خاص طور پر آپ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ لوگوں کی باتوں سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ آپ کا مقام و مرتبہ ان باتوں سے کہیں اونچا ہے اور رہے گا۔

(۷) سورت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا طریقہ بھی سکھایا گیا ہے۔

(۸) سورت میں دین دشمنوں کے بدترین انجام کی پیشین گوئی بھی کی گئی ہے۔

(۹) سورت میں ہر بندۂ مؤمن کے لیے تسلی کا سامان ہے جو لوگوں کے طعنے سنتا رہتا ہے اور اسے پریشان کیا جاتا ہے۔ انہیں تسلی دی جا رہی ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور ان کو کبھی گرنے نہیں دیتا۔

(۱۰) وہ لوگ جو مظلومیت اور دشمنی کا شکار ہیں ان کے لیے بھی یہ سورت بہت اہم ہے۔

☆ مدیر مدرسہ دار ارقم، لیاری، کراچی abdulmateen989@yahoo.com

پس منظر

رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت قاسم یا حضرت ابراہیم ؓ کا بچپن میں ہی انتقال ہوا تو کفارِ مکہ جشن منانے لگے، یہاں تک کہ نبی ﷺ کا چچا ابولہب لوگوں کے پاس جا کر مبارک باد دینے لگا کہ ''مبارک ہو! محمد کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے''۔ کفار کی سوچ یہ تھی کہ اب محمد (ﷺ) کی کوئی نرینہ اولاد تو ہے نہیں، سب لڑکیاں ہی ہیں اور نسل تو لڑکوں سے چلتی ہے جن کا انتقال ہو چکا، لہٰذا ان کی نسل آگے چلے گی ہی نہیں۔ جب نسل ہی نہیں چلنے والی تو ان کا پیغام بھی ان کی زندگی ہی تک محدود رہے گا اور اس طرح ان کے بعد کوئی نہیں ہوگا جو ان کے پیغام کو آگے لے جاسکے۔ وہ آپس میں یہ کہتے پھرنے لگے کہ اس کی پروا مت کرو، ابھی چاہے کتنا ہی شور شرابا ہو رہا ہے لیکن یہ سب زیادہ عرصے تک چلنے والا نہیں۔ کچھ وقت کی ہی بات ہے کہ ان کے دنیا سے جاتے ہی ان کی تحریک دم توڑ دے گی اور پھر سے ہمارے بتوں کا بول بالا ہوگا۔

اس سورت میں اللہ ربّ العزت نے رسول اللہ ﷺ کو دو خوش خبریاں ایک ساتھ سنائی ہیں کہ آپ اپنے بچے کی وفات پر اور ان دشمنوں کے تبصروں سے پریشان نہ ہوں، کیونکہ:

(۱) ہم آپ کو ''کوثر'' جیسے اعزاز اور انعام سے نواز رہے ہیں۔

(۲) جہاں تک دشمنوں کی بات ہے، وہ تو خود بے نام و نشان اور عبرت کا نمونہ بننے والے ہیں۔

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ صحابہؓ کے ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ آنکھ لگ گئی۔ پھر جھٹکے سے اٹھے تو مسکرانے لگے۔ صحابہؓ نے مسکراہٹ کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ ابھی وحی نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا: تمہیں معلوم ہے مجھے کیا ملا ہے؟ ان کی جانب سے لاعلمی کا اظہار کرنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ''کوثر'' سے نوازا گیا ہے۔

آیت ۱: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ①﴾

''(اے پیغمبر ﷺ!) یقین جانو ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دی ہے۔''

''کوثر'' کیا ہے؟

کوثر سے مراد خیرِ کثیر ہے، یعنی خیر کا اتنا بڑا اور زبردست سلسلہ جس میں دنیا اور آخرت کی

ہر خیر اور بھلائی شامل ہے۔ اس میں جنت کی ”کوثر“ نامی خاص نہر بھی شامل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

الْكَوْثَرُ الْخَيْرُ الْكَثِيرُ الَّذِي أَعْطَاهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ، قَالَ أَبُو بِشْرٍ قُلْتُ لِسَعِيدٍ: إِنَّ أُنَاسًا يَزْعُمُونَ أَنَّهُ نَهَرٌ فِي الْجَنَّةِ، فَقَالَ سَعِيدٌ: النَّهَرُ الَّذِي فِي الْجَنَّةِ مِنَ الْخَيْرِ الَّذِي أَعْطَاهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ (صحیح البخاری:۶۵۷۸)

”کوثر سے مراد بہت زیادہ بھلائی (خیر کثیر) ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائی۔ ابو بشر کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے کہا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے‘ تو انہوں نے کہا کہ جو نہر جنت میں ہے وہ بھی اس خیر اور بھلائی کا ایک حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو دی ہے۔“

یعنی کوثر کا تعلق ہر قسم کی خیر اور بھلائی سے ہے جس میں جنت کی نہر ”کوثر“ بھی شامل ہے اور یہ سب کچھ آپ ﷺ کے اعزاز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

کوثر میں کون کون سی بھلائیاں شامل ہیں‘ اس کے متعلق علماء فرماتے ہیں:

(۱) نبوت و رسالت کا ملنا
(۲) آپ ﷺ کا خاتم النّبیین ہونا
(۳) شبِ قدر کا تحفہ ملنا
(۴) قرآن کریم کا نازل ہونا
(۵) معراج کا سفر
(۶) معراج کے سفر میں نماز کا تحفہ ملنا
(۷) رمضان المبارک اور روزوں کا سلسلہ
(۸) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے جاں نثار ساتھیوں کا ملنا
(۹) اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بہترین اُمّت ہونا
(۱۰) مختلف جنگوں‘ غزوات اور فتح مکہ کی صورت میں کامیابی کا ملنا وغیرہ
(۱۱) حوضِ کوثر

حضرت عبداللہ بن زید المازنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِي عَلَى حَوْضِي))
(صحیح البخاری:۱۸۸۸)

”میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر قیامت کے دن میرے حوضِ کوثر پر لگے گا۔“

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”میرا حوض (لمبائی چوڑائی میں) مہینے کی مسافت کے برابر ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور اس کے برتن (تعداد یا خوب صورتی میں) ایسے ہیں جیسے آسمان کے ستارے۔ جس نے اس نہر میں سے ایک دفعہ پی لیا وہ پھر کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا۔“

اس نہر کا فاصلہ سینکڑوں کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید‘ شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوگا۔ اس نہر کی دیواریں سونے کی ہوں گی۔ اس نہر میں پینے کے پیالوں کی تعداد آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر ہوگی۔ اس نہر کی مٹی کی خوشبو مُشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔ اس نہر کا فرش یاقوت اور ہیرے جواہرات سے بنا ہوگا۔ سبحان اللہ!

نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اس نہر پر میں تم کو پانی پلاؤں گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ہمیں پہچانیں گے کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں تمہارے وضو کے اعضاء کی چمک سے پہچان لوں گا۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ فرماتے ہیں:

((لَمَّا عُرِجَ بِالنَّبِيِّ ﷺ إِلَى السَّمَاءِ قَالَ: أَتَيْتُ عَلَى نَهَرٍ حَافَتَاهُ قِبَابُ اللُّؤْلُؤِ مُجَوَّفًا، فَقُلْتُ: مَا هٰذَا يَا جِبْرِيلُ؟ قَالَ: هٰذَا الْكَوْثَرُ))
(صحیح البخاری:۴۹۶۴)

”جب نبی کریم ﷺ کو معراج ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک نہر کے کنارے پر پہنچا جس کے دونوں کناروں پر خولدار موتیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ حوض کوثر ہے (جو اللہ نے آپ کو دیا ہے)۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ، لَيُرْفَعَنَّ إِلَيَّ رِجَالٌ مِنْكُمْ حَتَّى إِذَا أَهْوَيْتُ لِأُنَاوِلَهُمُ اخْتُلِجُوا دُونِي، فَأَقُولُ أَيْ رَبِّ، أَصْحَابِي، يَقُولُ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ)) (صحیح البخاری:۷۰۴۹)

’’میں حوضِ کوثر پر تم لوگوں کا استقبال کروں گا‘ اور تم میں سے کچھ لوگ میری طرف آئیں گے۔ جب میں انہیں (حوض کا پانی) دینے کے لیے جھکوں گا تو انہیں میرے سامنے سے ہٹا لیا جائے گا۔ میں کہوں گا: اے میرے رب! یہ تو میرے ساتھی (اُمتی) ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ’’آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد (دین میں) کیا کیا نئی باتیں نکال لی تھیں۔‘‘

آیت ۲: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲﴾

’’پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔‘‘

نعمتوں پر شکر ادا کرنا

سورۃ الکوثر کی دوسری آیت میں کوثر جیسی عظیم نعمت ملنے کے بعد اس پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی نعمت کے ملنے پر اس کی قدردانی کا یہی طریقہ ہے کہ ربّ کریم کا شکر ادا کیا جائے۔

قرآن کریم سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شکر ادا کرنے سے نعمت میں برکت ہو جاتی ہے جبکہ ناقدری کرنے سے وہ نعمت چھینی بھی جا سکتی ہے۔ سمجھدار شخص وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر تفکر کرے‘ انہیں بار بار یاد کر کے غور و فکر کرے۔ اس طرح نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے‘ گناہوں سے بچنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اللہ ربّ العزت کے ساتھ بندے کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ فرماتے ہیں:

’’انسان کی دو ہی حالتیں ہیں۔ ایک جس میں اسے کچھ مل رہا ہے اور دوسرا جس میں نہیں مل رہا۔ جو کچھ مل رہا ہے اس پر شکر کرنا سیکھے اور جو نہیں مل رہا اس پر صبر کر کے اللہ سے بار بار ہر چھوٹی بڑی چیز مانگنے کی عادت بنا لے۔ جو شخص یہ دو کام کرے گا اس کا اللہ ربّ العزت کے ساتھ تعلق بہت جلدی بنے گا جو کہ بہت ہی آسان اور مختصر طریقہ ہے۔‘‘

آیت مبارکہ میں اللہ ربّ العزت نعمت ملنے پر شکر ادا کرنے کا طریقہ بھی خود سکھا رہے ہیں۔ اس آیت میں شکر ادا کرنے کے دو طریقوں کا ذکر ہے:

(۱) نماز کی ادائیگی (۲) قربانی

’’لِرَبِّكَ‘‘ یعنی ’’اپنے رب کے لیے‘‘ جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جب نعمت ربّ نے دی ہے تو نماز اور قربانی کا عمل بھی اُسی کو راضی کرنے کے لیے کرو۔ لہٰذا اپنے عمل میں اخلاص اور خالص پن پیدا کرو۔ ریاکاری اور لوگوں کو دکھانے کے لیے نیک کام مت کرو‘ ورنہ یہ بے وفائی کا سودا ہو جائے گا کہ لیا کسی سے جبکہ شکریہ کسی اور کا ادا کر رہے ہیں۔ نماز اور قربانی کا نام لے کر دین کے دو بڑے شعبوں کی طرف اشارہ فرمایا‘ کیونکہ اللہ کی عبادت کرنے کے دو ہی طریقے ہیں:

(۱) جانی عبادت (۲) مالی عبادت

جانی و بدنی عبادات میں نماز‘ روزہ اور حج جیسی عظیم عبادات شامل ہیں جن میں انسان اپنی جان اور بدن کی توانائی خرچ کر کے اللہ کی رضا حاصل کرتا ہے۔ مالی عبادات میں زکوٰۃ‘ قربانی اور حج جیسی عبادات شامل ہیں جن میں بندہ اپنا مال لگا کر اللہ کی رضامندی حاصل کر لیتا ہے۔

سورۃ الکوثر کی دوسری آیت میں اللہ ربّ العزت جانی اور مالی دونوں عبادات کا ایک ساتھ ذکر کر رہے ہیں کہ نماز اور قربانی ان دونوں کی ایک مجموعی شکل ہے۔ آیت میں خاص طور پر نماز اور قربانی کا حکم دیا گیا ہے‘ کیونکہ نماز اللہ ربّ العزت کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ جبکہ قربانی مال خرچ کرنے کا سب سے بہترین مصرف ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ ربّ العزت جب تمہیں کوئی نعمت دیں تو تم نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ اور قربانی وغیرہ جیسی عبادات کا اہتمام کرو۔ اس طرح تم نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے لائق بن سکو گے۔

آیت ۳: ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳﴾

’’یقین جانو تمہارا دشمن ہی بے نام و نشان ہونے والا ہے۔‘‘

دشمنانِ نبیؐ کے لیے اعلان

سورۃ الکوثر کی تیسری اور آخری آیت میں اللہ ربّ العزت اپنے محبوب نبی سرورِ دوعالم محمد مصطفیٰ ﷺ کو پیار بھری تسلی دے رہے ہیں۔ جب محبوب کو طعنے دیے جا رہے ہیں عین اسی موقع پر اللہ کی رحمت جوش میں آ رہی ہے کہ خبردار‘ میرے محبوب کو کچھ مت کہنا کیونکہ ان کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ آج کے بعد بس تم اپنی فکر کرو۔

’’ابتر‘‘ عربی زبان میں ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہو اور اس وجہ

سے اس کی نسل آگے نہ چل سکے۔ جو طعنہ آپ ﷺ کو دیا گیا' اللہ ربّ العزت نے اپنے حبیب کا بدلہ خود لیتے ہوئے انہی کی زبان میں جواب دیا کہ جس کو تم ''ابتر'' کہہ رہے ہو اس کا تم کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ اس طعنے کا شکار تم خود بننے والے ہو۔

اللہ ربّ العزت نے اپنا وعدہ اس طرح سچا فرما دیا کہ آج ڈیڑھ ہزار سال گزرنے کے باوجود آپ ﷺ کے نام کی دھوم مچا رکھی ہے جبکہ دشمن کا کچھ اَتا پتا نہیں۔ نسبی خاندان کے ساتھ ساتھ اللہ ربّ العزت نے آپ ﷺ کی روحانی اولاد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ''اُمّتِ مسلمہ'' کے نام سے جاری فرما دیا۔

اللہ ربّ العزت نبی مکرم ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ یہ لوگ آپ کے خلاف جو سازشیں کر رہے ہیں وہ تارِ عنکبوت (مکڑی کا جالا) ثابت ہوں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خاتونِ جنت بی بی فاطمۃ الزہراء ؓ کے مبارک بطن سے ساداتِ رسول کے نام سے دنیا کے چپے چپے میں آپ کی اولاد موجود ہے جن میں حسنی اور حسینی دونوں خاندان موجود ہیں۔ جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے نکلے تو صرف سیدنا ابوبکر صِدّیق ؓ ساتھ تھے اور جب واپس مکہ تشریف لائے تو دس ہزار کا لشکر فاتح بن کر اسی شہر میں داخل ہوا جہاں آپؐ کے دشمن ہوا کرتے تھے اور طعنے دیا کرتے تھے۔ آپؐ کے مبارک دور میں مکمل جزیرۂ عرب اسلام کے قریب آ گیا۔ آپؐ کے بعد خلفائے راشدین ؓ کے دور میں آدھی دنیا میں اسلام چھا گیا۔

ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں آج تک آپ ﷺ کا مبارک نام اذان کی صورت میں پوری دنیا میں کہیں نہ کہیں گونج رہا ہوتا ہے۔ نماز میں درود شریف کی صورت میں' قرآن میں' حدیث میں' ذکر و اذکار اور مناجات میں' ہر جگہ آپؐ کا نام نامی عقیدت' محبت اور عشق و سرور کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سیرتِ مصطفیٰ ﷺ پر دنیا میں سب سے زیادہ مواد تیار کیا جا چکا ہے اور صرف آپؐ کی مختصر سیرت نہیں بلکہ ایک ایک ادا کو محفوظ کر کے اُمّت تک پہنچایا جا رہا ہے۔ بالخصوص فنِ شعر و شاعری میں نعتیہ کلام کی ایک طویل فہرست ہے جو بڑھتی جا رہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی سیرت و کردار کی ہر ادا سے لے کر آپؐ کی زبان سے ادا شدہ ہر لفظ تک اور آپؐ کے پیغام سے آپؐ کے روضہ مبارک تک سب کچھ محفوظ ہے۔ یہ سب کا سب آپؐ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ آپ ﷺ کا نامِ مبارک زبان پر آنے کی صورت میں عقیدت و

محبت کے گہرے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں اور زبان درود و سلام سے تر ہو کر آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔

آیت میں آپ ﷺ کے دشمنوں کے خاتمے کا جو اعلان اللہ ربّ العزت فرما رہے ہیں یہ صرف اُس دور کے ابوجہل اور ابولہب کے لیے نہیں' بلکہ قیامت تک جو جو آپؐ کی ذات یا آپؐ کے پیغام کے ساتھ دشمنی کریں گے ان کے لیے یہی اعلان رہے گا۔ بقول اقبال: ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس دور میں بھی بولہبی شرارتیں سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ کوئی آزادئ اظہارِ رائے کے نام پر گستاخی کرتا ہے' کوئی کارٹون بنالیتا ہے' کوئی آپؐ کی حدیث کا انکار کر گزرتا ہے اور کوئی آپؐ کے منصب کو چھیننے کی کوشش کر کے ختمِ نبوت پر ڈاکا ڈالتا ہے۔ اللہ ربّ العزت نے اُمّتِ مُسلمہ کو' الحمدللہ' یہ توفیق دے رکھی ہے کہ وہ بظاہر کیسے بھی ہوں لیکن اپنے پیارے نبی ﷺ کی عظمت کے لیے ہر ممکن جدّوجُہد کرتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے تحریری' تقریری' سیاسی' قانونی' قومی' بین الاقوامی انداز کی ہر ممکن کوشش شامل ہوتی ہے۔ یہ سب ہزار بار کرنا پڑے تو ہزار بار بھی کر لیتے ہیں تا کہ باطل کو سمجھ آ جائے کہ یہ اُمّت اپنے نبی ﷺ کی حرمت پر کبھی بھی کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتی اور نہ ہی کسی کو ایسا کرنے دے سکتی ہے۔

تاریخ میں ایسی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن میں مُسیلمہ کذّاب کے خلاف صدّیق اکبر ؓ' غلام احمد قادیانی کے خلاف مہر علی شاہ صاحب گولڑوی' لاہور میں غازی علم الدین' جرمنی میں عامر چیمہ' لیاری میں غازی عبدالقیوم اور موجودہ دور میں قادیانی مقدمات کے خلاف بہت سے اکابر علماء' صوفیاءُ اللہ والے اور اُمّت کے مجاہدین نظر آتے ہیں۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ باطل کے مقدر میں اللہ ربّ العزت نے ہمیشہ کے لیے ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳﴾ کا اعلان کر دیا ہے۔

❁❁❁

کسبِ حلال

سعد عبداللہ☆

ہاتھ سے کما کر کھانا اور کسی ہنر یا صنعت کو معاش کے طور پر اختیار کرنا کوئی معیوب بات نہیں' بلکہ سوال سے بچنے اور رزقِ حلال کمانے کی نیت سے پیشہ اختیار کرنا بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ))[1]

''سچا اور امانت دار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء' صِدّیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

حضرت آدم علیہ السلام ہل چلاتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کپڑے سیتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام بکریوں کی نگہبانی کرتے تھے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام لوہے کی زِرہیں بناتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام امورِ سلطنت چلاتے تھے۔ ہمارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ اجیاد پر بکریوں کی نگہبانی فرماتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾﴾ (البقرۃ)

''اے لوگو! کھاؤ جو چیزیں زمین میں ہیں حلال اور پاکیزہ' اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کی نماز کے بعد جب سلام پھیرتے تو یہ دعا مانگتے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا طَيِّبًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا))[2]

''اے اللہ! میں آپ سے علمِ نافع' پاکیزہ و حلال رزق اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں۔''

☆ استاذ قرآن انسٹیٹیوٹ لطیف آباد' حیدر آباد

تجارت میں برکت

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، اَوْ قَالَ حَتّٰى يَتَفَرَّقَا، فَاِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا، بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَاِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا، مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا))[3]

''خرید و فروخت کرنے والوں کو اختیار ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں (کہ بیع فسخ کر دیں یا برقرار رکھیں)۔ پس اگر دونوں نے سچائی اختیار کی اور ہر بات کھول کھول کر بیان کی تو ان کی خرید و فروخت میں برکت ہوگی' اور اگر انہوں نے کچھ چھپائے رکھا یا جھوٹ بولا تو ان کے خرید و فروخت کی برکت ختم کر دی جائے گی۔''

شراکت داری میں نصرتِ خداوندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جب تک دو شراکت داروں (partners) میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کرتا' میں ان کے درمیان تیسرا ہوتا ہوں (یعنی میری تائید و نصرت اور برکت ان کے ساتھ شاملِ حال رہتی ہے)' لیکن جیسے ہی کوئی ایک خیانت کرتا ہے میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔''[4]

پورا پورا ناپ/تول کر دینا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾﴾ (بنی اسرائیل)

''اور جب (کوئی چیز) ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرو اور (جب تول کر دو تو) ترازو سیدھا رکھ کر تولو۔ یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔''

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰۗىِٕكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (المطففین)

''تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے' جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں

سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس بات کا یقین نہیں رکھتے کہ وہ (مرنے کے بعد دوبارہ) ایک بڑے سخت دن کے لیے اٹھائے جائیں گے‘ جس دن سب لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔‘‘

حضرت سوید بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور مخرفہ عبدی مقامِ ہجر سے کپڑے کا بنا ہوا سامان فروخت کرنے کے لیے آئے۔ نبی ﷺ بھی ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے ایک پاجامے کا بھاؤ تاؤ فرمایا۔ میرے پاس ایک وزن کرنے والا شخص تھا جو اُجرت لے کر وزن کیا کرتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس وزن کرنے والے شخص کو نصیحت فرمائی:

((زِنْ وَأَرْجِحْ))(۵)

’’تولو اور جھکتا ہوا تولو۔‘‘

عیب بتا کر مال فروخت کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اناج کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس کے اندر ڈالا تو انگلیوں پر تری آ گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ’’اے اناج کے مالک! یہ کیا ہے؟‘‘ اُس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! یہ بارش میں بھیگ گیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ، مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي))(۶)

’’پھر تم نے اس بھیگے ہوئے اناج کو اوپر کیوں نہ رکھا کہ لوگ دیکھ لیتے؟ (اور عیب پر آگاہ ہو جاتے)۔ جو شخص دھوکا دے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يَبِيعَ شَيْئًا إِلَّا بَيَّنَ مَا فِيهِ، وَلَا يَحِلُّ لِمَنْ عَلِمَ ذٰلِكَ إِلَّا بَيَّنَهُ))(۷)

’’کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کوئی چیز فروخت کرے جب تک کہ اس کے عیبوں کو بیان نہ کر دے۔ اور جو بھی اس کے عیبوں کو جانتا ہو اس پر لازم ہے کہ وہ انہیں (خریداروں کے سامنے) بیان کرے۔‘‘

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ بَاعَ مِنْ أَخِيهِ بَيْعًا فِيهِ عَيْبٌ إِلَّا بَيَّنَهُ لَهُ))(۸)

’’مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو عیب والی چیز فروخت کرے‘ سوائے اس کے کہ وہ اس عیب کو اس کے لیے بیان کر دے۔‘‘

قسمیں کھا کھا کر مال فروخت نہ کرنا

سیدنا ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((إِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْحَلِفِ فِي الْبَيْعِ، فَإِنَّهُ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ))(۹)

’’بیع میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو‘ کیونکہ وہ پہلے (بیع کو) فروغ دیتی ہے‘ پھر (برکت اور نفع کو) مٹا دیتی ہے۔‘‘

نیز رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ وَمُمْحِقَةٌ لِلْكَسْبِ))(۱۰)

’’قسم سے سودا بک جاتا ہے اور کمائی (کی برکت) مٹ جاتی ہے۔‘‘

بعض لوگ اپنا تجارتی ساز و سامان جلد از جلد بیچنے کے لیے گاہکوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ یہ اِس قدر سنگین گناہ ہے کہ قیامت کے روز ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ نہ بات کرنا پسند کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا بلکہ انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ العیاذ باللہ! نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ))

’’تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ بات چیت کرے گا‘ نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا‘ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔‘‘

آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار کہے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’وہ یقیناً ذلیل و خوار ہوں گے اور خسارہ پائیں گے۔ یارسول اللہ ﷺ! وہ کون ہیں؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْبِلُ إِزَارَهُ، وَالْمَنَّانُ، وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ))[۱۱]

''اپنے تہ بند کو (ازراہِ تکبر) نیچے لٹکانے والا' احسان جتلانے والا اور اپنے سودے کو جھوٹی قسم کھا کر بیچنے والا۔''

دھوکا دہی اور ملاوٹ سے بچنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا))[۱۲]

''جس نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں' اور جس نے ہمیں دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں۔''

حرام آمدنی والے کی دعا قبول نہیں ہوتی

نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ دور دراز کا سفر کرتا ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ بکھرے بال اور غبار آلود کپڑوں والا ہے۔ یہ شخص اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلا کر کہتا ہے: ''اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!'' لیکن اس کا کھانا بھی حرام' پینا بھی حرام' لباس بھی حرام اور حرام سے ہی اس کے جسم کی نشوونما ہوئی۔ تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟ (صحیح مسلم)

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

حضرت معمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ))[۱۳]

''ذخیرہ اندوزی کرنے والا گناہ گار ہے۔''

دوسری روایت میں الفاظ ہیں:

((لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ))[۱۴]

''ذخیرہ اندوزی گناہ گار ہی کرتا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص مسلمانوں کی غذائی ضروریات کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے کوڑھ اور تنگ دستی کے مرض میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔'' (ابن ماجہ)

قیمتوں میں مصنوعی اضافہ کرنے کا وبال

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے قیمتوں میں کسی قسم کی دخل اندازی کی تاکہ مسلمانوں پر چیزیں مہنگی کر دے تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ ایسے شخص کو قیامت کے دن آگ کے ہولناک حصے پر بٹھائے۔'' (مسند احمد بن حنبلؒ)

سلفِ صالحین کا طرزِ عمل

سلفِ صالحین کے زمانے میں جب مرد کمانے کے لیے نکلتا تھا تو گھر کی خواتین اسے کہتی تھیں کہ حرام کمانے سے بچنا' کیونکہ ہم بھوک پر تو صبر کر سکتے ہیں مگر دوزخ کی آگ پر صبر نہیں کر سکتے!

حواشی

(۱) سنن الترمذی:۱۲۰۹ (۲) سنن ابن ماجہ:۹۲۵

(۳) صحیح البخاری:۲۱۱۱ (۴) المستدرک علی الصحیحین للحاکم

(۵) سنن الترمذی:۱۳۰۵ (۶) صحیح مسلم' ح ۲۸۴

(۷) المستدرک:۲۱۵۷۔ صححہ الحاکم ووافقہ الذہبی

(۸) سنن ابن ماجہ:۲۲۴۲' وصححہ الألبانی

(۹) صحیح مسلم:۴۱۲۶

(۱۰) صحیح البخاری:۲۰۸۷' صحیح مسلم:۱۲۰۶

(۱۱) صحیح مسلم:۱۰۶ (۱۲) صحیح مسلم:۲۸۳

(۱۳) صحیح مسلم:۴۱۲۲ (۱۴) صحیح مسلم:۴۱۲۳

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

عالَمِ اسلام کی زبوں حالی اور اس کا علاج

ممتاز ہاشمی☆

پورے عالَمِ اسلام اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ میں بڑھتی ہوئی مغربی تہذیب اور دیگر مشرکانہ اقدامات پر ہر اہلِ ایمان پریشانی اور دکھ میں مبتلا ہے۔ اس پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کرنا چاہیے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑲﴾ (النور)

’’یقیناً جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔‘‘

اس آیت کی روشنی میں ہم جب مسلمان ممالک میں ناچ گانے کی مخلوط محفلوں کے انعقاد اور فسق وفجور اور بے حیائی پر مبنی دیگر سرگرمیوں پر غور کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ سب ہمارے اعمال کے نتیجے کے طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ایک عذاب ہے۔ وہ تمام لوگ جو ان سرگرمیوں کے انعقاد یا ان کے فروغ کا باعث بن رہے ہیں‘ یا ان میں شریک ہو رہے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کا دوٹوک اعلان کیا ہے۔

پاکستان میں بھی یہ سرگرمیاں عرصہ دراز سے جاری وساری ہیں‘ اور وقت گزرنے کے ساتھ ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ انتہائی شرم ناک بات ہے کہ وہ واحد ملک جس کے قیام کی بنیاد ہی دینِ اسلام کو قائم کرنا تھا‘ جس کا وعدہ ہمارے آباء واجداد نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کیا تھا‘ آج اس کے عوام کی غالب اکثریت ان بڑھتے ہوئے باغیانہ رجحانات پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس ضمن میں ہمیں

☆ای میل: mhashmi100@hotmail.com

اس حدیثِ نبویؐ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزَعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ)) قِيْلَ: وَمَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) [سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام]

’’قریب ہے کہ دیگر قومیں تم پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تو ایک کہنے والے نے کہا: کیا ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں‘ بلکہ تم اس وقت (تعداد میں) بہت ہو گے‘ لیکن تم سیلاب کی جھاگ کے مانند ہو گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا‘ اور تمہارے دلوں میں ’’وہن‘‘ ڈال دے گا۔ تو ایک کہنے والے نے کہا: اللہ کے رسول! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہ دنیا کی محبت اور موت کا ڈر ہے۔‘‘

اس حدیث کی روشنی میں آج ہم مسلمانوں اور عالمِ اسلام کا حال دیکھیں تو صورتِ حال ایسی ہی دکھائی دے رہی ہے۔ مسلمان ممالک کے حکمران طبقے‘ سول اور ملٹری بیوروکریسی‘ عدلیہ وغیرہ کی اکثریت بالعموم منافق‘ کرپٹ‘ ظالم‘ عیاش اور اسلام دشمن عناصر کے ایجنٹ ہیں۔ ان کا مسلمانوں پر مسلط ہونا اللہ کے عذاب کی گواہی دے رہا ہے کیونکہ ہمارے اندر ایمان کا فقدان ہے اور مذکورہ بالا حدیث کے مطابق دنیا کی محبت اور موت کا ڈر ہے۔ اگرچہ ہم اپنے آپ کو آزاد کہلاتے ہیں مگر ہم میں ذہنی غلامی نہایت گہرائی تک سرایت کر چکی ہے۔ نتیجہ کے طور آج کم وبیش پورا عالمِ اسلام ذہنی غلامی اور پس ماندگی میں مبتلا ہے۔

مختلف علاقوں میں مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی پر دنیا خاموش رہتی ہے۔ مسلمان ممالک بھی اپنے آپ کو رسمی احتجاجی بیانات تک محدود رکھتے ہیں‘ کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ حالیہ تاریخ میں‘ خاص طور پر فلسطینی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم میں مسلم

ممالک نے کفار کی خاموش حمایت کی ہے۔ چنانچہ لاکھوں مظلوم و مجبور مسلمانوں کے قتل میں عالمِ اسلام بھی واضح طور پر کفار کے جرائم میں برابر کا شریک ہے۔سورۃ البقرہ میں یہود پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے جہاں ان کے جرائم کی فہرست سامنے رکھی گئی ہے وہاں انہیں یہ بھی باور کرایا گیا ہے کہ:

﴿ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَاۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

’’پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی لوگوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی لوگوں میں سے کچھ کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو‘ اُن پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور ظلم و زیادتی کے ساتھ۔ اور اگر وہ قیدی بن کر تمہارے پاس آئیں تو تم فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے ہو‘ حالانکہ اُن کا نکال دینا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اُس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے سوائے ذلّت و رسوائی کے دنیا کی زندگی میں‘ اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔ اور اللہ غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔‘‘

یہود کے اس طرزِ عمل میں مسلمانوں کے موجودہ حالات اور کردار کے بارے میں واضح اشارہ موجود ہے۔ اس سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ آج مسلمان کیوں ذلیل و خوار ہیں۔ مذکورہ آیت میں واضح اعلان کیا گیا ہے کہ ایسے مسلمانوں کو روزِ قیامت شدید ترین عذاب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ یہ یقینی طور پر انتہائی تشویش ناک صورتِ حال ہے جب کہ ہر مسلمان کی پہلی ترجیح دوزخ سے بچنا اور جنت کے حصول کی کوشش کرتے رہنا ہے۔

ایک مسلمان کو یہاں تک پہنچانے میں جو عمل سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے وہ جھوٹ اور منافقت ہے۔ جھوٹ بولنے سے دوسری تمام برائیوں کو خود بخود پنپنے کا موقع ملتا ہے اور آخر کار یہ نفاق کی انتہائی شکل اختیار کرتے ہوئے انسان کو پختہ منافق کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں منافق کے انجام کے بارے میں واضح طور پر ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا﴿۱۴۵﴾﴾ (النساء)

’’منافق تو یقیناً جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے۔ ناممکن ہے کہ تو ان کا کوئی مددگار پالے۔‘‘

اس بارے میں مزید وضاحت مندرجہ ذیل احادیث سے ہو جاتی ہے:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) (صحیح البخاری:۳۳)

’’منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرے جھوٹ بولے‘ جب وعدہ کرے اس کے خلاف کرے‘ اور جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔‘‘

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((إِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَأْتِي هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ)) (صحیح مسلم: ۲۶۳۰)

’’لوگوں میں سے بدترین شخص دو چہروں والا ہوتا ہے‘ جو کچھ لوگوں کے پاس ایک چہرے سے آتا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کے پاس دوسرے چہرے سے آتا ہے۔‘‘

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا)) (صحیح مسلم:۲۶۳۹)

’’تم صدق پر قائم رہو‘ کیونکہ صدق نیکی کے راستے پر چلاتا ہے اور نیکی جنت کے راستے پر چلاتی ہے۔ انسان مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور کوشش سے سچ پر قائم رہتا ہے‘ حتیٰ کہ وہ اللہ کے ہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے‘ اور جھوٹ سے دور رہو‘ کیونکہ جھوٹ کج روی کے راستے

پر چلاتا ہے اور کج روی آگ کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا قصد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔‘‘

ربّ العالمین نے مسلمانوں کو نفاق سے بچنے اور اس دنیا میں غالب ہونے کا طریقہ بھی اس طرح سے بیان کیا ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾﴾ (آل عمران)

’’اور کمزوری نہ دکھاؤ اور نہ غمگین ہو (کیونکہ) اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔‘‘

ہر زمانے اور دور میں ایسے لوگوں کی موجودگی ہوگی جو لوگوں کو اس نفاق سے بچانے اور حق وسچائی پر قائم رہنے کے لیے رہنمائی فراہم کرنے کا باعث ہوں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿١٥﴾﴾ (الحجرات)

’’مومن تو وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر (پختہ) ایمان لائیں پھر شک وشبہ نہ کریں اور اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں۔ (اپنے دعوائے ایمان میں) یہی سچے اور راست گو ہیں۔‘‘

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾﴾ (آل عمران)

’’تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور بُرے کاموں سے روکے‘ اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔‘‘

مؤمن کی شخصیت کے خدوخال کو مفکّرِ اسلام علامہ اقبال نے اشعار کے پیرائے میں یوں بیان کیا ہے: ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
اَفلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن

ایمان کے دعوے داروں کی اس عارضی زندگی کا اصل مقصد نفاق سے بچنا اور حقیقی مؤمن بننا ہے تاکہ آخرت میں کامیابی کے حصول کی امید کی جا سکے۔ اس عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے لائحہ عمل کو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ قرآن وسُنّت میں بیان کردہ مؤمن کی خصوصیات کو اپنانے کی کوشش اور اس دنیا میں دین اسلام کے غلبے کی جِدّوجُہد ہی ہمیں آخرت میں کامیابی کے حصول میں مددگار ثابت ہوگی۔ لہٰذا موجودہ طاغوتی نظام کو ختم کر کے اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنے کی جِدّوجُہد میں ہر مسلمان کا انفرادی کردار‘ اس کے دستیاب وسائل اور حیثیت کا پیمانہ ہی قیامت کے روز جزا اور سزا کا تعین کرے گا۔ اس کے لیے اپنے اردگرد مؤمن لوگوں کی تلاش کریں اور ان کے ساتھ مل کر اس جِدّوجُہد میں سُنّتِ رسولؐ پر چلتے ہوئے اپنے حصے کا کام کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو غلبہ واقامتِ دین کے لیے مختص کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ ویڈیو کیسٹس/ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

اسماء اللہ الحسنیٰ (۲)

از: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۶) السَّلَامُ

لفظ سَلامؒ بطور اسم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے معنی سالم ہیں یعنی وہ ذات جو سلامتی میں کامل ہو‘ جس کی سلامتی کو خطرۂ زوال نہ ہو‘ وہ جو دوسروں کو سلامتی بخشتی ہو۔ السَّلام (اَمن دینے والا) سورۃ الحشر کی آیت ۲۳ میں دیگر اسماء الحسنیٰ کے ساتھ آیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہر نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے:

((اللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ))

’’اے اللہ تُو سلامتی والا ہے اور تُو ہی سلامتی عطا کرنے والا ہے‘ اے عظمت و بزرگی اور بڑی سخاوت و فیاضی والے! تو بڑا بابرکت ہے۔‘‘

صحیح بخاری کے مطابق اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ ؓ کو حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا سلام اور اپنا سلام پہنچایا تو انہوں نے جواب میں کہا: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ وَمِنْهُ السَّلَام ’’بے شک اللہ تعالیٰ تو خود سلامتی کا مالک ہے اور ہم کو سلامتی اُسی سے ملتی ہے۔‘‘

سلام مصدر بھی ہے۔ جنّت میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ملے گا۔ سورۂ یٰسٓ میں ارشاد ہے: ﴿سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝۵۸﴾ ’’سلام کہا جائے گا ربِّ رحیم کی طرف سے‘‘۔ ملائکہ بھی اہلِ ایمان کو سلام کریں گے اور وہاں اہلِ ایمان آپس میں بھی ایک دوسرے کو سلام کے ہی تحفے بھیجا کریں گے۔ سورۂ یونس کی آیت ۱۰ میں ارشاد ہے: ﴿وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ﴾ ’’اور اس (جنّت) میں ان کی (آپس کی) دعا ’سلام‘ ہوگی۔‘‘

حضور اکرم ﷺ کا اپنی اُمّت پر ایک حق یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ پر کثرت سے صلوٰۃ و سلام بھیجا جائے۔ سورۃ الاحزاب میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا

تَسْلِيْمًا ۝۵۶﴾ ’’اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر رحمتیں اور سلام بھیجا کرو۔‘‘ جب بھی مسلمان آپس میں ملیں تو حدیث کے مطابق ایک دوسرے کو سلام کرنے کا حکم ہے۔

(۷) الْمُؤْمِنُ

اس کے معنی کی دو صورتیں ہیں: اول کہ مؤمن‘ ایمان سے بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمن ہے کہ بندے کو ایمان عطا کرتا ہے۔ سورۃ الحجرات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ﴾ (آیت ۷) ’’لیکن اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے۔‘‘ سورۃ المجادلہ میں صحابہؓ کی شان میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ﴾ (آیت ۲۲) ’’یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا نام مؤمن (ایمان سے) اس لیے بھی ہے کہ وہ خود بھی اپنی ذات کی شہادت (گواہی) دیتا ہے جیسے کہ یہ شہادت ایمان لانے والا بندہ بھی ادا کرتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸﴾

’’اللہ خود گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور سارے فرشتے (گواہ ہیں) اور اہلِ علم بھی (اس پر گواہ ہیں)‘ وہ عدل وقِسط کا قائم کرنے والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہ زبردست ہے‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

دوم کہ مؤمن امن سے بنا ہے‘ اللہ تعالیٰ مؤمن ہے جو امن بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بیت اللہ کو جائے امن بنایا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ﴾ (آیت ۱۲۵)

’’اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر (بیت اللہ) کو قرار دے دیا لوگوں کے لیے اجتماع (اور زیارت) کی جگہ اور اسے امن کا گھر قرار دے دیا۔‘‘

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے توحید کو قلوب کا امن بتلایا ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۸۲﴾

’’یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو کسی طرح کے شرک سے

آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی راہ یاب ہوں گے۔‘‘

(۸) اَلْمُهَيْمِنُ

لفظ ’’مُهَيْمِن‘‘ میں میم ثانی بالکسر ہے۔ اس کے معنی ہیں: (ا) نگہبان (ب) وہ جو دوسرے کے خوف سے ہم کو محفوظ و مامون بنا دے (ج) وہ امین جو کسی کا حق ضائع نہ کرے (د) وہ جو ہر ایک خوف و خطر کو دور کر دے۔ ان جملہ صفات میں یہ باری تعالیٰ کا نام ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۸ میں قرآن مجید کو مُهَيْمِن فرمایا گیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ﴾

’’اور (اب اے نبی ﷺ) ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر نگران ہے۔‘‘

گویا کہ قرآن پاک اپنے سے پہلی الہامی کتابوں کے مضامین کا نگہبان ہے۔ قاموس میں ہے کہ مهیمن اصل میں مآمن (دو ہمزہ کے ساتھ) تھا‘ ہمزہ اول کو حرف ھا سے بدل لیا گیا اور ہمزہ ثانی کو حرف یا سے‘ یوں مهیمن ہو گیا۔

(۹) اَلْعَزِيْز

یہ عزّت سے بنایا گیا ہے۔ عزت کے معنی قوت و شوکت اور غلبہ کے ہیں۔ عزیز وہ ہے جس میں یہ صفات بدرجۂ اَتم پائی جائیں۔ سورۃ الحشر کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے حوالے سے العزیز (غالب) کا اسم آیا ہے۔

اہلِ دنیا نے زر و مال‘ جمعیت و تعداد کی کثرت کا نام عزت رکھ چھوڑا ہے۔ یہ وہ بُت ہے جو دنیا والوں کو سب سے پیارا ہے اور وہ اس پر اپنی جان و ایمان کو بخوشی قربان کر دیتے ہیں۔ لوگ دنیا والوں کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں‘ جبکہ سورۃ المنافقون میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (آیت ۸) ’’حالانکہ اصل عزّت تو اللہ‘ اُس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کے لیے ہے۔‘‘ اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۳۹﴾﴾ ’’حالانکہ عزت تو کُل کی کُل اللہ کے اختیار میں ہے۔‘‘

قرآن حکیم میں لفظ ’’عزیز‘‘ یا ’’العزیز‘‘ ۹۲ مرتبہ آیا ہے۔ سورۂ یوسف میں چار مرتبہ

یہ لفظ ’’عزیزِ مصر‘‘ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ باقی تمام مقامات پر یہ اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام کے طور پر آیا ہے۔ اکثر مقامات پر یہ اسم دوسرے اسمائے حُسنیٰ کے ساتھ جوڑے کی صورت میں آیا ہے۔ مثلاً: سب سے زیادہ اَلۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ یا عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ قرآن مجید میں ۴۲ مرتبہ آیا ہے۔ اَلۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۱۳ بار‘ اَلۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ۶ بار‘ قَوِيٌّ عَزِيۡزٌ یا الۡقَوِيُّ الۡعَزِيۡزُ ۷ بار آیا ہے۔ اسی طرح اَلۡعَزِيۡزُ الۡغَفَّارُ ۳ مرتبہ‘ اَلۡعَزِيۡزُ الۡحَمِيۡدُ ۳ مرتبہ‘ عَزِيۡزٌ ذُوانۡتِقَامٍ ۴ مرتبہ اور عَزِيۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ ایک مرتبہ آیا ہے‘ جبکہ ایک جگہ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ اور ایک جگہ اَلۡعَزِيۡزُ الۡغَفُوۡرُ بھی آیا ہے۔ ان جملہ آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مالک الملک جسے ساری مخلوق پر غلبۂ تام اور اقتدارِ کامل حاصل ہے‘ جو لائقِ حمد و ثنا ہے‘ وہ اپنے اقتدار اور قدرت کا استعمال حکمت‘ رحم‘ غفران‘ حلم اور علم کے ساتھ فرماتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جن کو دنیائے فانی میں چند روزہ محدود غلبہ کسی مقام یا اشخاص پر حاصل ہو گیا ہو اور وہ اپنے اختیارات کا استعمال بغیر سوچے سمجھے اندھا دھند کرتے ہیں‘ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔

(۱۰) اَلْجَبَّار

یہ جبر سے ہے جس کے معنی درستی کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لفظ کسر آتا ہے جس کے معنی شکستگی کے ہیں۔ انسان کے لیے جبّار کا لفظ ’’جبّار النخل‘‘ کے حوالے سے بتایا گیا ہے‘ یعنی وہ کھجور جو اتنی بلند ہو کہ اس پر چڑھنے کا حوصلہ نہ پڑے‘ کیونکہ سرکش‘ سنگ دل‘ بے رحم لوگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں کہ ان سے خلقِ خدا کو آزار و تنگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا‘ وہ کسی کا حق اپنے اوپر نہیں سمجھتے‘ اسی لیے جبار کہلاتے ہیں۔ سورۂ ہود میں قومِ عاد کے حوالے سے ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ﴿۵۹﴾﴾ ’’اور انہوں نے پیروی کی ہر سرکش و دشمنِ حق کے حکم کی۔‘‘ اسی طرح سورۂ ابراہیم میں سرکش نافرمان قوموں کے حوالے سے فرمایا گیا: ﴿وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ﴿۱۵﴾﴾ ’’اور تمام سرکش ضدی لوگ نامراد اور ناکام ہو گئے۔‘‘ سورۃ الحشر کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے حوالے سے الجبّار (زور آور‘ سختی کرنے والا) کا لفظ بھی آیا ہے۔ اسی جبر سے جبروت بھی بنا ہے‘ جو کہ اس کا مبالغے کا صیغہ ہے۔ سنن ابی داوٗد کے مطابق حضور کریم ﷺ سجدے میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: ((سُبْحَانَ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ)) ’’پاک ہے وہ ذات جو بہت غلبے اور قدرت والی ہے اور

ملک و بادشاہت والی ہے اور بڑائی اور عظمت والی ہے۔"

(۱۱) اَلْمُتَكَبِّرُ

یہ لفظ کِبَرٌ سے بنا ہے جس کے معنی رفعت' شرف' بڑائی اور بزرگی کے ہیں۔ اہلِ دنیا کا نام متکبر اس لیے برا ہے کہ ان میں درحقیقت رفعت و شرافت ذاتی نہیں ہوتی' اضافی اوصاف سے وہ جھوٹے غرور میں آ کر متکبر بن جاتے ہیں اور اپنی نوع کے دیگر انسانوں کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جسے حقیقت میں کبریائی حاصل ہے اور وہی ذات ہے جو اپنی صفت میں خود کو متکبّر کہہ سکتی ہے۔ سورۃ الحشر کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے ذیل میں اَلْمُتَكَبِّرُ (کبر اور بڑائی والا) بھی آیا ہے۔ بندوں کے ذیل میں اس لفظ کا استعمال بطور فعل سورۃ الزمر کی آیت ۵۹ میں نافرمانی اور سرکشی کے حوالے سے ہوا ہے: ﴿بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ﴾ "کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیات آئی تھیں تو تُو نے ان کو جھٹلا دیا تھا اور تکبر کیا تھا۔" المتکبّر اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ معبود جو اپنی ذات میں علو و برتری میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہے اور جو صفاتِ ذمیمہ اور اخلاقِ رذیلہ سے ہر لحاظ سے برتر و بالا ہے۔

(۱۲) اَلْخَالِقُ

یہ اسم خَلَقَ (ن) سے بنا ہے اور خلق کے معنی تقدیر و اندازہ ہے۔ خالق وہ ذات ہے جس نے ماہیات کا اندازہ اور ذوات کا تعین فرمایا' جو حقائق کو عدم سے وجود میں لایا۔ لفظ خلق کا استعمال قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہوا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ (آیت ۵۴) "بے شک تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین"۔ سورۃ الانبیاء میں فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ (آیت ۳۳) "اور وہی ہے جس نے پیدا کیا رات اور دن کو۔" سورۃ الملک میں بتایا گیا: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ﴾ (آیت ۲) "جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔" سورۃ الزخرف میں ارشاد ہوا: ﴿خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۱۲) "جس نے بنائے ہیں تمام مخلوقات کے جوڑے۔" سورۂ یٰسٓ میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾﴾ "اور وہ ہر مخلوق کا مکمل علم رکھنے والا ہے۔"

آیاتِ بالا پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی وغیر مادی (ہر دو قسم) اشیاء پر خلق کا لفظ استعمال ہوا ہے' البتہ خلق کا لفظ کسی مادی شے کو کسی خاص شکل میں تیار کرنے پر بھی آتا ہے جیسے کہ سورۂ آلِ عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہوا: ﴿اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ﴾ (آیت ۴۹) "میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی مانند صورت بناتا ہوں۔" انہی معنی کے لحاظ سے سورۃ المؤمنون میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾﴾ "پس بڑا بابرکت ہے اللہ' تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔" سورۃ الحجر میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾﴾ "یقیناً آپؐ کا رب پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے۔" پس اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے' خلّاق بھی ہے اور احسن الخالقین بھی۔ یہ تینوں الفاظ اگرچہ ایک صفت خلق سے تعلق رکھتے ہیں' لیکن ہر ایک میں جداگانہ کیفیت و خصوصیت موجود ہے۔

(۱۳) اَلْبَارِئُ

یہ اسم "بَرَأَ" (ف) سے ہے' یعنی نیست سے ہست کرنا۔ عدم سے وجود میں لانا۔ بَرَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ بَرْءًا وَبُرُوْءًا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ (آیت ۵۴) "پس اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف۔" سورۃ الحشر کے آخر میں اسمائے الٰہی کے ذیل میں یہ اسم بھی آتا ہے: اَلْبَارِئُ (وجود بخشنے والا)۔

(۱۴) اَلْمُصَوِّرُ

اس اسم مبارک کا معنی ہے: صورت بنانے والا۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ﴾ (آیت ۶) "وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے (تمہاری ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے۔" سوۃ الحشر کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے اَلْمُصَوِّرُ (صورت بنانے والا) بھی آتا ہے۔ دنیا میں جو انسان مصور کہلاتے ہیں' وہ صورت بنانے والے نہیں ہوتے بلکہ صورت کی نقل اتارنے والے ہوتے ہیں۔ پھر وہ نقل بھی اصل سے کوئی حقیقی مطابقت نہیں رکھتی۔ مصورِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' جس نے کروڑوں' اربوں' کھربوں صورتیں بنائی ہیں۔ اس کے باوجود ہر ایک صورت دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ اس تفریق کو اول جنس میں' پھر نوع میں' پھر صنف میں

اور پھر افراد میں دیکھیں' یہ تمام سلسلہ عجائب در عجائب امور پر مشتمل ہوگا۔ وہی ذات باری تعالیٰ ہے جو عدم کو وجود بخشتی ہے' وہی ہے جو جسم کو روح عطا کرتی ہے' وہی ہے جو سب کو اپنی اپنی شکل و صورت میں انفرادی و امتیازی شان بخشتی ہے۔

(۱۵) اَلْغَفَّار

غَفَرَ (ض) غَفْرًا وَغُفْرَانًا کے معنی ہیں چھپانا' ڈھانپ دینا۔ غَفَرَ الْمَتَاعَ فِی الْوِعَاءِ ''کپڑے صندوق میں رکھ لیے''۔ غَفَرَ الشَّیْبَ بِالْخِضَابِ ''سفید بالوں کو خضاب سے چھپا دیا''۔ اسی مصدر سے غَفُور بھی آتا ہے غَافِر بھی اور غَفَّار بھی۔ سورۃ المؤمن میں ذاتِ باری تعالیٰ کے حوالے سے ارشاد ہوا: ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ﴾ (آیت ۳) ''گناہ کا بخشنے والا''۔ سورۃ نوح میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰﴾ ''یقیناً وہ بہت بخشنے والا ہے''۔ سورۃ الزمر میں باری تعالیٰ کے حوالے سے ارشاد ہوا: ﴿اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۵﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! وہ زبردست ہے' بہت بخشنے والا''۔ عزّت و قوت اور قدرت و شوکت کے ساتھ غفران کی شان اور بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ سورۃ النجم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ﴾ (آیت ۳۲) ''یقیناً آپ کا ربّ بہت ہی وسیع مغفرت والا ہے''۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝۱۵۵﴾ ''اور یقیناً تمام بخشنے والوں میں تُو سب سے بہتر بخشنے والا ہے''۔ ان آیات میں ایسے اسمائے مرکبہ استعمال ہوئے ہیں جو غفران کے مصدر سے ہیں اور یہ سب اس کے مراتب کو بحیثیت وسعت و اہلیت و خیریت ظاہر کرنے والے ہیں۔

اس اسم سے فیض حاصل کرنے کے لیے کثرت سے استغفار کرنا چاہیے۔ صحیح بخاری میں مندرجہ ذیل دعا کو ''سیّد الاستغفار'' فرمایا گیا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ، وَاَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ، وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ، فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ))

''اے اللہ! تُو میرا ربّ ہے' معبود تُو ہے اور کوئی نہیں۔ تُو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے۔ میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے عہد اور وعدہ پر قائم ہوں جتنا کہ مجھ سے ہو سکتا ہے۔ اپنے کرتوتوں کی بُرائی سے میں تیری پناہ کا خواہاں ہوں۔ تیری نعمتیں جو مجھ پر ہیں مجھے ان کا

اقرار ہے اور مجھے اپنے گناہوں کا بھی اقرار ہے۔ پس تُو مجھے بخش دے' گناہوں کو تیرے سوا اور کوئی نہیں بخشتا''۔

(۱۶) اَلْقَھَّارُ

یہ قہر سے ہے جس کے معنی غلبہ کے ہیں۔ قہار وہ ذات ہے جو ہر ایک غالب سے غالب تر ہے' جو ہر ایک زبردست کو زیر کرنے والی ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا گیا: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ﴾ (آیت ۱۸) ''اور وہی ذات اپنے بندوں کے اوپر پوری طرح غالب ہے''۔ سورۃ الاعراف میں فرعون کی زبان سے کہلوایا گیا: ﴿وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝۱۲۷﴾ ''اور یقیناً ہم ان پر پوری طرح غالب ہیں''۔ کسی انسان کا یہ دعویٰ کہ وہ کسی دوسرے انسان یا قوم یا ملک پر غلبۂ تام رکھتا ہے' اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ فرعون کا قول بنی اسرائیل کے حوالے سے تھا۔ ایسا دعویٰ تو ذلت و رسوائی اور ہلاکت و تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ یہ اسم تو صرف ربّ العالمین ہی کے لائق ہے جو ہماری روح اور ہمارے جسم پر پورا غلبہ رکھتا ہے۔ ہمارا زمین پر چلنا پھرنا' زیرِ آسماں بے فکر رہنا سہنا محض اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے ہم کو فائدہ اٹھانے کا حق (حقِ تمتع) دیا ہے' ورنہ یہی زمین ہم کو اپنا لقمہ بنا سکتی ہے اور یہی آسمان ہم کو پرکاہ کی طرح جلا سکتا ہے۔ ذرا درج ذیل آیاتِ قرآنی پر غور کریں:

سورۂ یوسف میں فرمایا: ﴿ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹﴾ ''کیا بہت سے متفرق ربّ بہتر ہیں یا پھر اکیلا اللہ جو سب پر حاوی و غالب ہے؟'' سورۃ الرعد میں ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۶﴾ ''اور وہ ہے یکتا' سب پر حاوی''۔ سورۂ صٓ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۶۵﴾ ''اور نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے' وہ اکیلا ہے اور ہر چیز پر پوری طرح چھایا ہوا ہے''۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۴۸﴾ ''اور یہ حاضر ہو جائیں گے اللہ کے سامنے جو واحد و قہار ہے''۔ سورۃ المؤمن میں روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدا بلند ہوگی اور پھر اُسی کی طرف سے جواب ہوگا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۱۶﴾ ''کس کے لیے ہے بادشاہی آج کے دن؟ (جواب ملے گا:) اکیلے اللہ کے لیے ہے جو تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے''۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسم قہار میں ایک نرالی اور جلالی شان ہے۔ وہ الوہیت اور

وحدانیت کے سوا کسی اور اسم کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ یہی اسم ہمیں بتلاتا ہے کہ وجود کو اعیان پر اور واجب الوجود کو امکان پر کس طرح غلبۂ کُلّی حاصل ہے کہ کوئی شے‘ کوئی امر‘ کوئی زمان‘ کوئی مکان اُس ذاتِ واحد کے غلبے سے باہر نہیں۔ قرآن پاک میں القھار ۶ مرتبہ اور ہر دفعہ الواحد کے ساتھ آیا ہے۔

(۱۷) اَلْوَھَّابُ

یہ وَھَبَ (ف) وَھْبًا وَھِبَۃً سے ہے۔ وَھَّاب کے معنی کثیر الھبۃ اور دائم العطاء ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ھبۃ کی حقیقت وہ عطیہ ہے جو بلا کسی غرض وامید اور بلا کسی عوض کے ہو۔ سورۂ آل عمران میں ذاتِ باری تعالیٰ کے حوالے سے ارشاد ہوا: ﴿اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ⑧﴾ ’’یقیناً تُو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔‘‘ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) کا عطیہ دیا گیا تو آپ نے ان الفاظ میں اللہ ربّ العزت کا شکر ادا کیا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ﴾ (ابراھیم:۳۹) ’’کُل شکر اور کُل ثنا اُس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے عطا فرمائے‘ باوجود بڑھاپے کے‘ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ (جیسے بیٹے)۔‘‘ سورۂ صٓ میں ارشادِ الٰہی ہوا: ﴿وَوَھَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ ؕ﴾ (آیت ۳۰) ’’اور ہم نے داوٗدؑ کو سلیمانؑ (جیسا بیٹا) عطا کیا۔‘‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا پر جب اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی بنایا تو سورۂ مریم میں فرمایا گیا: ﴿وَوَھَبْنَا لَہٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاہُ ھٰرُوْنَ نَبِیًّا ⑤③﴾ ’’اور ہم نے اُسے عطا کیا اپنی رحمت سے اُس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر۔‘‘ سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی دعا نقل کی گئی ہے: ﴿رَبِّ ھَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ⑧③﴾ ’’اے میرے پروردگار! تُو مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے اپنے صالح بندوں میں شامل کر دے۔‘‘

آیاتِ بالا پر غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ عموماً اسم وَھَّاب کے ساتھ رحمت کا ذکر ضروری ہے اور ربّ العالمین کی جملہ عطایا کا مدار اُس کی رحمت پر ہی ہے‘ اور اسی رحمت سے ہی صفت وہابیت کا ظہور ہوتا ہے۔ وَھَّاب وہ ذات ہے کہ عطائے صوری ومعنوی اور عطیاتِ دُنیوی و اُخروی کی وہی مالک ہے۔ بندے کے پاس اس کے اپنے گھر کی بالکل کوئی شے نہیں۔ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے‘ وہ سب عطائے الٰہی اور اُس کی بے پناہ سخاوت وعطا کا نتیجہ ہے۔ (جاری ہے)

❁❁❁

آہ قمر سعید قریشی!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

مولانا شیخ رحیم الدین

۱۱ جولائی ۲۰۲۵ء بروز جمعۃ المبارک یہ دل خراش اطلاع ملی کہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ترین ساتھی قمر سعید قریشی انتقال کر گئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے لیے ’’ساتھی‘‘ کا لفظ بہت حقیر اور کمتر ہے۔ جو صحیح لفظ میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا عاشق زار آج اس دارِ فانی سے دار الخلد کی طرف مراجعت کر گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری اور میں کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ ۸۳-۱۹۸۲ سے آج تک کے تمام واقعات اور وہ لمحات جو ان کی سرپرستی اور معیت میں گزرے ایک فلم کی شکل میں دماغ کی سکرین پر چلنے لگے اور اب سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کہاں سے شروع کروں۔

قمر سعید قریشی صاحب ۱۹۳۷ء میں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ سکول و کالج کی تعلیم کے بعد سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد واپڈا کے مختلف ہائیڈرل پروجیکٹس سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۱ء میں آپ پاکستان ریلوے سے وابستہ ہو کر کوئٹہ میں تعینات ہوئے اور پھر پاکستان کے مختلف شہروں سیالکوٹ‘ فیصل آباد اور لاہور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور اپنی خدمات احسن طریقے سے انجام دیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ منٹگمری (ساہیوال) سے لاہور منتقل ہوئے اور درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو ۱۹۶۸ء میں قمر سعید قریشی صاحب رابطے میں آ گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے دل میں دعوتِ دین کی جو تڑپ شعلہ جوالہ بن کر سرگرداں تھی وہ قمر سعید قریشی کے سینے میں منتقل ہوئی اور اب یہ ایک اور ایک دو نہیں بلکہ ایک اور ایک گیارہ بن گئے۔ اس کے بعد قمر صاحب کے نزدیک زندگی کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کر اس منصوبے کو جو ڈاکٹر صاحب کے دل و دماغ میں

پرورش پا رہا تھا‘ منصۂ شہود پر لانا تھا۔ اس کے لیے آپ نے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا۔ اپنے عزیزوں اور گھر والوں سے واجبی سا تعلق رکھا لیکن ان کے حقوق برابر ادا کرتے رہے۔ ان دونوں حضرات نے جب دعوت الی القرآن کا کام شروع کیا تو بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ قمر سعید صاحب کے پاس ایک ویسپا سکوٹر تھا جس پر اکثر ڈاکٹر صاحب کو پیچھے بٹھا کر وہ دروس میں لے جایا کرتے تھے‘ حتیٰ کہ بعض دفعہ میثاق کی طباعت واشاعت کے لیے مکتبہ جدید پریس بھی اسی ویسپا پر لے جاتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کا اعلان کیا تو قمر سعید قریشی مؤسسین میں شامل تھے۔ صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے قمر سعید صاحب کو انجمن کی رکن سازی کی مہم چلانے کا کہا اور یہ ٹاسک دیا کہ آپ ۴۰۰ حضرات سے بالمشافہ مل کر ان کو انجمن کا رکن بنانے کی کوشش کریں۔ الحمدللہ اس مردِ قلندر نے چار سو سے زائد افراد سے فرداً فرداً مل کر ان کو رکن بننے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت پر بہت سارے حضرات لبیک کہہ کر انجمن کے رکن بنے اور وہ بھی انجمن کے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا تو قمر سعید قریشی صاحب اس کے تاسیسی ارکان میں شامل تھے۔ آپ نے اپنی ذات کو ڈاکٹر صاحب کی ذات میں گم کر دیا تھا۔ آپ ڈاکٹر صاحب کے چشم و ابرو کے اشارے کو اپنے لیے حکم کا درجہ سمجھتے تھے اور اس حکم کی بجا آوری میں اپنے جسم و جان کی ساری توانائیاں لگا دیتے تھے۔ ربّ کریم بھی اپنے اس مخلص بندے کی لاج رکھتے تھے اور وہ مشکل سے مشکل کام آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔ مَیں نے قمر سعید قریشی صاحب کو ۱۸،۱۸ گھنٹے کام کرتے دیکھا ہے۔ ۱۹۸۶ء کے رمضان المبارک میں ان کی مصروفیات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتنی خداداد صلاحیتیں رکھی ہیں۔ آپ صبح نو بجے کے قریب انجمن کے دفتر سے رابطے کے لیے نکلتے اور مغرب سے قبل واپس آتے‘ جبکہ یہ رمضان المبارک جون جولائی میں تھا۔ پھر رات بھر دورۂ ترجمہ قرآن میں شریک رہتے اور آنے والے حضرات سے رابطہ فرماتے‘ ان سے انجمن اور تنظیم کے اغراض ومقاصد بیان کر کے اس کام کو آگے بڑھانے کی سبیلیں نکالتے۔

محترم قمر سعید قریشی انجمن اور تنظیم کے ڈھانچے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔

آپ ان دونوں تنظیم میں مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہے‘ اور جس عہدے پر بھی رہے اس کا حق ادا کر دیا۔ آپ ایک طویل عرصے تک مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ناظم اعلیٰ رہے۔ آپ کی زبان میں قدرے لکنت تھی‘ اس لیے ان کو تقریر اور درس دیتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ آپ نے اس کمی کو اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تحریری قابلیت سے پورا فرمایا۔ آپ ایک دن میں کئی کئی صفحات کے دسیوں خطوط تحریر فرماتے۔ خطوط تحریر کرنے میں آپ کا انداز ناصحانہ اور برادرانہ ہوتا تھا۔ آپ کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ انجمن اور تنظیم کے متعلقین سے ذاتی رابطہ رکھتے تھے‘ ان کی خوشی اور غمی کے مواقع پر اپنی مصروفیات اور عوارض کو پس پشت ڈال کر شرکت فرماتے۔ ایک دفعہ اسلام آباد میں مقیم انجمن کے ایک رکن کے بیٹے کے ولیمے میں صرف آدھ گھنٹے کے لیے تشریف لے گئے اور واپس لاہور آ گئے اور یہ سارا سفر پبلک ٹرانسپورٹ پر کیا۔ آپ اپنے ماتحت عملے سے بھی ذاتی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی خوشی وغمی میں شامل ہوتے اور اپنی خوشی کے مواقع پر عملہ کے لوگوں کو شامل کرتے تھے۔

قمر سعید قریشی صاحب انتہائی نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ بہت عمدہ اور صاف ستھرا لباس زیب تن فرماتے۔ ان کے استعمال کی اشیاء بھی بہت اعلیٰ قسم کی ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ مجھے اپنا قلم دیا کہ اس میں ریفل ڈلوانا ہے اور یہ ریفل مال روڈ پر ایک معروف دکان سے ملے گا۔ میں وہاں پہنچا اور قلم کا ریفل مانگا تو دکان دار نے قیمت بہت زیادہ بتائی۔ مَیں دوسری دکان پر گیا تو وہاں یہ ریفل بہت قلیل قیمت میں مل رہا تھا۔ میں نے قمر صاحب سے فون پر رابطہ کیا اور یہ صورتحال بتائی تو آپ نے فرمایا: بھئی یہ جس کمپنی کا قلم ہے اسی کمپنی کا ریفل ڈلوانا ہے‘ آپ قیمت پر نہ جائیں۔

محترم قمر سعید صاحب ارادے اور عزم کے پکے تھے‘ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر ان کو سکون نہ ملتا تھا۔ مثال کے طور پر آپ نے قرآن مجید حفظ کرنے کا ارادہ کیا جبکہ آپ کی عمر کافی ہو چکی تھی اور اس عمر میں حفظ کرنا ناممکن ہوتا ہے‘ لیکن اس آہنی اعصاب کے مالک نے اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک قرآن پاک مکمل حفظ نہ کر لیا۔ پھر اس حفظ کو برقرار رکھنے کے لیے جو محنت شاقہ کی وہ ہم نوجوانوں کے لیے لائق تقلید ہے۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے اغراض و مقاصد کو آگے بڑھانے اور اس کی

بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اپنے جسم و جاں کی ساری توانائیاں لگا دیں۔ محترم قمر سعید قریشی صاحب حضرت ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد بجھ سے گئے تھے‘ اور کیوں نہ بجھتے‘ ان کا آئیڈیل‘ ان کا محبوب‘ ان کا ہادی اور پیر و مرشد اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اس فراق میں وہ روز بروز گھلتے گئے اور زندگی ان کے لیے اجیرن بن گئی۔ چنانچہ وہ جو کبھی شمع محفل ہوا کرتے تھے اب انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اس غم و صدمے کو اپنے اندر سمو لیا جس کی وجہ سے کئی امراض لاحق ہو گئے اور ’’مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی‘‘ والی صورتحال ہو گئی۔ کئی سال کی گوشہ نشینی اور امراض کو سہتے سہتے آخر کار وقت موعود آ پہنچا اور آپ نے داعیٔ اجل کو خوش دلی سے لبیک کہتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ؏ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

نمازِ جنازہ بعد نماز عشاء ادا کی جانی تھی۔ میت جب نماز جنازہ کے لیے مسجد جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور لائی گئی تو مسجد اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگیٔ داماں کی شکایت کرنے لگی۔ نماز جنازہ میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ قریباً ہر ایک کی زبان موصوف کی للّٰہیت اور انسان دوستی کے تذکروں سے تر تھی اور ہر ایک ان کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کر رہا تھا۔ میرا ذہن فوراً اس محاورے کی طرف مبذول ہو گیا کہ ’’زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو‘‘۔ اتنے سارے لوگوں کی گواہی اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ وہ مقبولِ بارگاہ بندے تھے۔

اس موقع پر ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے فرزند رشید محترم ڈاکٹر عارف رشید صدر انجمن خدّام القرآن لاہور نے سوگواروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ابی نے ایک بار ایک نجی محفل میں فرمایا تھا: ’’روزِ محشر جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہو گی اور وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ تم کیا نیک عمل لائے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ قمر سعید قریشی اور ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ لایا ہوں۔‘‘

نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ کراچی سے تشریف لائے۔ آپ نے اس موقع پر مختصر مگر جامع انداز میں موت و حیات کے موضوع پر خطاب فرمایا اور نماز جنازہ کی امامت فرمائی۔ نماز جنازہ میں انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے ذمہ داران اور عہدے داران کی کثیر تعداد حاضر تھی اور سب نے انتہائی دل گرفتگی سے اپنے بزرگ ساتھی کو دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع کیا۔ انجمن خدام القرآن اور تنظیم

اسلامی کے ذمہ داران اور ارکان قمر سعید قریشی صاحب کے پس ماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعاگو ہیں کہ ربّ کریم ان کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان سب کو موصوف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے مشن کو آگے سے آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

مضمون کے اختتام پر اپنے استاد و مربّی شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہ کے چند اشعار ہدیتاً پیش ہیں‘ جو کہ ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہیں:

باقی کوئی دنیا میں رہا ہے نہ رہے گا
جانا ہے اسے کل جو آیا ہے یہاں آج
ناگاہ کوئی دم میں یہ لد جائے گا ڈیرا
دھوکے ہیں یہ سب جن پہ ہے منزل کا گماں آج
دنیا تو بس اِک مرحلہ ہے راہِ عدم کا
اور موت کے محمل میں ہے رخت دل و جاں آج
آسی یہ غنیمت ہیں تری عمر کے لمحے
وہ کام کر اب تجھ کو جو کرنا ہے یہاں آج!

❁❁❁

ماہنامہ ”میثاق“ لاہور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزّہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

Aug 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.8

Monthly **Meesaq** Lahore

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ 10 ماہ)

عرصہ 43 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

تعلیمی قابلیت: کم ازکم انٹرمیڈیٹ
عمر: کم ازکم 22 سال

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرائمر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولُغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی ﷺ
- مطالعہِ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سال دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

ایام تدریس: پیر تا جمعہ

اوقات تدریس: صبح 8:15 بجے تا 01:00

☆ رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔ ☆ انٹرویو 01 ستمبر
آغاز کلاسز 02 ستمبر 2025ء (اِن شاءاللہ)

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لئے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔
لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز
زیر انتظام: مرکزی انجمن خدّام القرآن (رجسٹرڈ) لاہور

قرآن اکیڈمی 36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem. org
مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3